اکتوبر ۱۹۹۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)



تفہیم القرآن کے بعد

تفہیمِ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے

سیرتِ سرورِ عالم ؐ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

***

جلد اوّل ———— بنیادی مباحث

جلد دوم ———— ولادت سے ہجرت تک

سائز: ۲۰×۲۶/۸ ○ کتابت: دلکش ○ طباعت: عکسی ○ جلد: نفیس

ضخامت جلد اوّل: ۷۶۴ صفحات ◉ ضخامت جلد دوم: ۷۶۴ صفحات

دونوں جلدیں نقشے اور تصاویر سے مزین ہیں

قیمت مکمل سیٹ: ۲۰۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ○ لاہور

جلد ۱۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲ء عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل۔ ۵۳۲۰

جلد ۱۱۸ عدد ۴

اکتوبر ۱۹۹۲ء ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰۔ فون نمبر ۹-۵۴۰۱۲۴، فیکس: ۰۴۲-۵۴۱۹۰۴۲

برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰۔ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے ○ زرِ سالانہ: ۶۰ روپے (اندرونِ ملک)

سید حسین فاروق مودودی نے مکتبہ جدید محمد پریس، لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

خرم مراد

"زندگی کے صحیح اسلامی زندگی ہونے کے لیے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین (اقامتِ دینِ حق) سے وابستگی ہے۔ اس وابستگی کا تقاضا ہے کہ آدمی نصب العین کے لیے جدوجہد کرے اور جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے" (رسائل و مسائل' اوّل' ص ۳۰۸)

اقامتِ دین فرضِ عین ہے' اور اس کے لیے اجتماعی جدوجہد ناگزیر --- سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس دور میں دعوت الی اللہ کی جو صدا بلند کی' اس میں یہی وہ دو بنیادی چیزیں تھیں جن کے اوپر ایمان و یقین کا جذبہ' جن کا خواب' جن کے لیے شوقِ جستجو' جماعتِ اسلامی کے قالب میں ڈھل گیا۔ جماعت کو جو کچھ بقا و استحکام اور توسیع و تقویت نصف صدی پر محیط عرصہ میں نصیب ہوئی' وہ انھی دو چیزوں کی وجہ سے نصیب ہوئی' اور اگر کچھ ضعف اور شکست وریخت اس کے حصہ میں آئی وہ بھی بالعموم انھی کی وجہ سے۔ اگر کوئی جماعت سے چمٹا رہا تو وہ بھی انھی کی محبت میں چمٹا رہا' اور اگر کوئی کٹا اور اس نے فصل کی راہ پکڑی یا تخریب و عداوت پر کمر باندھی تو وہ بھی بالعموم انھی کی وجہ سے' کہ کسی کو اس جماعت میں اپنا خواب بکھرتا نظر آیا' کسی کو وہ کسی اور ہی پٹڑی اور راہ پر' یا کسی اور ہی منزل کی جستجو میں سرگرداں دکھائی دی۔

دو انسان کبھی بھی بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جبلّت اور مزاج مختلف' افتادِ طبع مختلف' صلاحیت و استعداد مختلف' انداز و اطوار مختلف' تعلیم و تربیت مختلف' ماحول و ماضی مختلف' سوچ سمجھ اور رائے مختلف' مقاصد اور آرزوئیں مختلف' تجزیہ و تاویل مختلف' بیان و کلام مختلف' اندرو باہر کی دنیا مختلف' شکل اور رنگ مختلف' یہاں تک کہ انگلیوں کی لکیریں بھی مختلف۔ اس طرح سے مختلف دو انسانوں کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنا' منسلک رکھنا' ایک راہ پر اور ایک

منزل کی طرف گامزن رکھنا' ان کی استعداد و صلاحیت کو بروئے کار لانا' ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا ازالہ کرنا' ان کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا' اور سارے اختلافات اور ناگواریوں اور افتراق کے بھرپور مواقع کے باوجود جوڑے رکھنا ——— یہ کوئی آسان کام نہیں' بلکہ شاید دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے' کوہ کنی کر کے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جڑنا اور جڑے رہنا' پہاڑ اٹھانے سے زیادہ گراں ہے' بکھر جانا پلک جھپکتے کا کام۔ اس کے باوجود اگر اتنے مختلف النوع انسان مجتمع ہو جاتے ہیں' تنظیم کے شیرازہ میں منسلک ہو جاتے ہیں' اجتماع و تنظیم کے بل پر اتنے بڑے بڑے اور محیر العقول کارنامے سرانجام دے لیتے ہیں' تو یہ یقیناً آیات و معجزاتِ الٰہی میں سے ایک آیت اور ایک معجزہ ہے۔ اگر ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا تو انسانی زندگی کی گاڑی ایک لحہ بھی نہ چل سکتی' بلکہ اگر دو بالکل مختلف انسان یک جان ہو کر ایک گھر بنانے کا کام نہ کر پاتے' تو انسانی زندگی کی بقا ہی ناممکن تھی۔

انسانوں میں خدا کے پیدا کردہ اختلاف ہی کی وجہ سے یہ امکانات پیدا ہوئے کہ ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جائیں' ایک اور ایک مل کر صرف دو بن جانے ہی پر قناعت کر جائیں' یا ایک اور ایک مل کر صفر یا صفر سے بھی ماورا کوئی منفی عدد ہو کر رہ جائیں' اگر وہ ایک دوسرے کی نفی کرنا اور ٹانگ کھینچنا شروع کر دیں۔ یہ مختلف امکانات ہر زمانہ میں' ہر وقت' ہر سطح پر' ہر نوعیت اور ہر پیمانہ کی اجتماعیت میں ظہور پذیر ہوتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ خاندانوں میں' قوموں میں' بڑی بڑی جماعتوں میں' تاریخ کے مختلف ادوار میں' اسلام کے صدرِ اوّل میں' خود جماعتِ اسلامی کے مختلف ادوار میں بھی ان کا مشاہدہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

جماعتی زندگی محض ایک دینی فریضہ ہی نہیں' بلکہ ایک منظم جماعت کے بغیر اقامتِ دینِ حق کا وہ عظیم الشان مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دراصل ایک نئے انسان' ایک نئی دنیا اور ایک نئی تہذیب کی تشکیل اور امامتِ عالم کا منصب سنبھالنے کا متقاضی ہے۔ کوئی تنہا فرد' یا افراد کا ایک ہجوم' وہ بڑے اجتماعی کام نہیں کر سکتا جو افراد کی ایک تنظیم کر سکتی ہے' یہ کام بچہ کی پرورش کرنا ہو' ایک ریاست کو چلانا ہو' ایک جنگ جیتنا ہو' چاند پر پہنچنا ہو' یا ایک تہذیبی انقلاب برپا کرنا ہو۔ لاکھوں اینٹوں کا ڈھیر جمع کر دیجیے' وہ کوئی بوجھ نہیں اٹھا سکتیں' ان سے کسی مکان کی تشکیل اور تصویر گری نہیں ہو سکتی۔ چند اینٹوں کو سیمنٹ سے جوڑ کر بنیانِ مرصوص بنا دیجیے' وہ بڑے بھاری بوجھ بھی اٹھا سکتی ہیں' عالیشان عمارتوں کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ اسی لیے اسلام میں جماعت ایک عظیم شان و مقام کی حامل ہوئی' اسی لیے نماز جیسی روحانی عبادت'

جو بندہ اور رب کے درمیان ملاقات و مناجات کا نام ہے' جماعت کے ساتھ فرض ہوئی' اسی لیے صدقہ و خیرات جیسے محبتِ الٰہی کے اظہار کو اجتماعی تحصیل و تقسیم کی شکل دی گئی' اسی لیے اطاعتِ الٰہی میں بھوکے پیاسے رہنے اور راتوں کو جاگنے کے لیے سب کو مجتمع کر دیا گیا' اسی لیے حج جیسی عشق و سرمستی سے لبریز عبادت کا نقطۂ کمال صرف ایک میدان میں اجتماعِ عام قرار پایا' اسی لیے کہا گیا کہ اسلام بغیر جماعت کے نہیں۔

پھر کیوں کہ اقامتِ دینِ حق کے نصب العین کے حصول کا انحصار جماعت پر ٹھہرا' اس لیے ضروری ہوا کہ جماعت' اور اس سے وابستہ افراد' زیادہ سے زیادہ ان خوبیوں کے حامل ہوں جن سے جماعت مستحکم اور قوی اور اپنے مقصد کے حصول کی استعداد کی حامل ہو' اور ان خرابیوں' خامیوں اور فتنوں سے محفوظ رہیں جن سے جماعت کمزور ہو' اور وہ اپنے مقصد کے حصول کی استعداد کھوتی چلی جائے۔ چنانچہ اس بات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ قرآن مجید نے نماز کے اوقات تو بالتصریح بیان نہیں کیے' رکعات کی تعداد اور دیگر شرائط' ارکان اور فرائض کا بھی تقریباً ذکر ہی نہیں کیا۔ ہاں' سب کے لیے' ہر جگہ' ہر حالت میں' مسجدِ حرام کے قبلہ کی طرف رخ کرنے کا تکرار کے ساتھ حکم دیا کہ ساری امت کا رخ ایک ہو' مقصود ایک ہو' اس میں ہم آہنگی اور ہم رنگی ہو۔ جمعہ کی نماز کے لیے' ہر کام چھوڑ کر' دوڑ پڑنے اور لپک کر آنے کی منادی خود قرآن نے کی۔ زکوٰۃ کا نصاب متعین نہ کیا' نہ حج کے مناسک تصریح کے ساتھ بیان کیے۔ ہاں' میراث کے حصص تفصیل کے ساتھ متعین کیے' نکاح و طلاق کے مسائل کی پوری تصریح کی' گھروں میں آنے جانے اور مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب و ضوابط تک خود مقرر فرمائے' میر مجلس' سے کلام کرنے کے بارے میں ہدایات دیں۔ اسی طرح باہمی تعلقات کے ضمن میں' اخوت' بات چیت تک میں عدل اور شیریں کلامی' معاملات میں مکمل عدل' پاسِ عہد' امانت داری' نرمی و رافت' عفو و درگزر' نظم و ضبط' حلم اور اعراض عن الجاہلین وغیرہ کا حکم فرمایا' اور تمسخر' ہمز' لمز' تنابز بالالقاب' سوئے ظن' تجسس' غیبت' تفاخر' تنازع وغیرہ کو حرام کیا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے التزام سے ایک اسلامی جماعت افتراق و انتشار اور جدال و تنازع سے محفوظ ہو سکتی ہے' اور اس کو استحکام و قوت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک اور ایک مل کر صفر بننے سے بچ سکتے ہیں' اور گیارہ بلکہ ایک سو گیارہ بن سکتے ہیں' اور ایک' دس پر بھاری ہو سکتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتی زندگی کے بارے میں جو تفصیلی ہدایات دی ہیں' ان میں سے اہم ہدایات کا خلاصہ تین نکات پر مشتمل ہے' اور

انہی پر جماعت کی قوت اور زندگی کا انحصار ہے:

۱۔ مقصد کے لیے مکمل یکسوئی' اور اس کے ساتھ ایسی وابستگی اور محبت جو ہر وابستگی اور محبت پر حاوی ہو۔ ایمان' محبت' حنیفیت' اخلاص' وغیرہ اسی نکتہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

۲۔ مکمل اتحاد' اورافتراق و تنازع سے اجتناب' اور اس مقصد کے لیے باہمی اخوت و محبت کا التزام اور فساد کرنے والے اعمال سے اجتناب۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا " (آل عمران ۳ : ۱۰۳) وَلَا تَنَازَعُوْا (الانفال ۸ : ۴۶) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹ : ۱۰) لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (ایضاً" : ۱۱) لَا تَلْمِزُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَ لْقَابِ (ایضاً") اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا" مِّنَ الظَّنِّ (ایضاً" : ۱۲)وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا" (ایضاً") وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران ۳ : ۱۳۴) وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (الانعام ۶ : ۱۵۳) قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲ : ۸۳) يَقُوْلُوْا الَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ (الاسراء ۱۷ : ۵۳) وغیرہ کے قبیل کی ہدایات اسی ضمن میں ہیں۔

۳۔ سمع و اطاعت اور مشاورت۔

جماعتِ اسلامی اور سید مودودیؒ نے روزِ اوّل ہی سے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جماعت اور وابستگانِ جماعت میں' بحیثیت جماعت بھی اور بحیثیت فرد بھی' جماعتی زندگی کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات' تعلیمات' اور احکام کا' تعلیم و تذکیر اور احتساب و تادیب کے ذریعے' زیادہ سے زیادہ التزام کیا جائے۔ نصف صدی کی مدت میں جماعت نے بحیثیت جماعت جو قوت بھی حاصل کی ہے اور وہ جو خدمت بھی انجام دینے کے قابل ہوئی ہے' وہ سب سے بڑھ کر انہی ہدایاتِ الٰہی کے التزام کی وجہ سے ہے اور جب بھی وہ کبھی کبھی ژولیدگیِ فکر' جمود' ضعف' انتشار' باہمی نزاع و جدال' خلفشار اور اندرونی شکست و ریخت جیسے امراض کا شکار ہوئی ہے' تو انہی ہدایات کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بحیثیت مجموعی جماعت میں خیر کا غلبہ رہا ہے اور وہ صحیح راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس سے دین کی جو کچھ خدمت بن پڑی ہے وہ اسی خیر کے باعث ہے۔ اس خیر کا بقا اور اس میں اضافہ جماعت کے ہر بہی خواہ کا فرض اوّلین ہے۔

ہم جیسے انسان' جو فطرتاً" خطاونسیان اورضعفِ ارادہ کا شکار ہیں' ہر وقت اور ہر حال ہی میں اس بات کے محتاج ہیں' لیکن آج کے حالات میں جماعت جیسے خیر کی بقا و استحکام کے لیے یہ

احتیاج کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے' کہ جماعتی زندگی کے بارے میں ہدایاتِ الٰہی کو برابر یاد رکھا جائے' ان کی تذکیر کی جاتی رہے' اور جماعتی زندگی میں وَذَکِّرْ (اور تذکیر کرتے رہو) پر پورے اہتمام سے کاربند رہا جائے' اس لیے کہ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ (ایمان لانے والوں کو تذکیر ہی سے نفع ہوتا ہے)۔ کل کے فتنے ہوں یا آج کے' اسی طرح ان سے زیادہ سے زیادہ مامون و محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

آج یہ امر شدّت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ اقامتِ دین کے مقصد کے لیے انسانوں کو جوڑ کر رکھنے' اور ایک منظم قوت بنانے کی انتہائی کٹھن اور صبر آزما چوٹی سر کرنے کی اس کامیاب کوشش ـــــ جماعتِ اسلامی ـــــ میں اختلاف اپنی جائز حدود سے تجاوز کر چکا ہے' اور اس اختلاف کے افتراق و انتشار میں تبدیل ہونے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ جماعت کے اندر اضطراب اور خلفشار بھی ہے' اور وہ باہر سے بھی اغیار کی یلغار کی زد میں ہے۔ دلوں میں بے اطمینانی بھی ہے' اور وہ سب بلا سبب اور بے بنیاد نہیں ہے۔ اسکے اندرونی معاملات اخباری شہ سرخیوں اور کالموں کا موضوع بنے ہوئے ہیں' جو مزید اضطراب کا باعث ہے۔

اتفاق سے اس زمانہ میں ارکانِ جماعت آئندہ پانچ سالوں کے لیے اپنے امیر کا انتخاب بھی کر رہے ہیں۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہے' اور کوئی وجہ نہیں کہ ارکان حسبِ معمول اپنی رائے اپنی صوابدید کے مطابق استعمال نہ کریں۔ وہ اپنے رائے کے مختار ہیں' چاہیں تو موجودہ امیر کو دوبارہ یہ ذمہ داری سپرد کر دیں' یا ان کی رائے میں کوئی دوسرا محترم رکن امارت کے لیے زیادہ اہل قرار پائے' یا وہ کسی نکٹے حبشی کو منتخب کر لیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جماعت جس کو بھی منتخب کرے گی' موجودہ امیر کی طرح ہی اس کی اطاعت کرے گی اور اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی' لیکن بد قسمتی سے اندر اور باہر کے چند "دوستوں" نے اس انتخاب کا رشتہ بھی کلیتاً حالیہ اختلاف اور عدم اطمینان کے ساتھ جوڑ دیا ہے' اور پھر اس حوالہ سے ایسی چیزیں سامنے لا رہے ہیں' جن کو سمجھنا مشکل ہو رہا ہے۔ باہر کے لوگ اگر اس انتخاب میں دلچسپی لے رہے ہیں' اس پر رائے زنی کر رہے ہیں' یا اس میں دخل دے رہے ہیں' تو صحیح بات یہ ہے کہ اس پر چیں بجبیں ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ کیا جماعت اور اس کا امیر آخر کار پوری قوم کی امامت کے لیے کوشاں نہیں ہیں؟ بظاہر "اپنے" اگر اغیار کی طرح وسوسہ کاریوں میں مشغول ہیں' تو اس پر جذبات کا کھولاؤ فطری ہے' لیکن صبر کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ ہاں' اندر والوں کے حدود سے

تجاوز پر اضطراب بجا ہے۔

اس صورتِ حال میں ہر درد مند کے دل کو چند پریشان کن سوالات بے کل کر رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر طرف ہر طرح کی چہ مگوئیاں ہیں' طرح طرح کی رائے زنی کی جا رہی ہے۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا' جو اب ہو رہا ہے۔ پہلے داخلی امور کے بارے میں یہ تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ ان پر باہر کے حلقوں میں بحث و تمحیص ہو گی' یا ان کو اخباری کالموں میں موضوع بحث بنایا جائے گا۔ ایسا بھی پہلے کبھی نہیں ہوا کہ امیرِ جماعت کی ذات مابہ النزاع ہو گئی ہو' اس کو امارت کے لیے غیر موزوں قرار دیا گیا ہو' اس پر آمریت' اور دستور کی یا شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کے الزامات عائد کیے گئے ہوں' اس کی پالیسیوں اور اقدامات کو جماعت کا رخ بدل دینے اور اس کو پٹڑی سے اتار دینے کا موجب قرار دیا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے کارکنانِ جماعت کی سوچ میں یکسانی اور یک رنگی تھی' وہ کسی درجہ میں بھی ذہنی انتشار اور فکری ژولیدگی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسی خیالی' کاغذی تصویر ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں' اور انسانوں کی کسی جماعت میں' وہ کتنے ہی پاکیزہ نفوس پر مشتمل ہو' اس خیالی تصویر کا حقیقت ہونا بعید از امکان اور خلافِ فطرت ہے۔ ان سوالات و احساسات کے ضمن میں اگر چند بنیادی امور پیش نظر رکھے جائیں' تو درد تو شاید کم نہ ہو' الجھن کم ہو سکتی ہے۔

انسانوں کے مختلف ہونے' اور ان کو جوڑ کر رکھنے کی مشکلات کی جو حقیقت اوپر بیان کی جا چکی ہے' یہ آشکار کرنے کے لیے کافی ہے کہ کسی بھی معاشرہ' گروہ' یا جماعت میں کسی بھی نوع کے اختلافات کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ صدرِ اوّل کے پاکیزہ ترین نفوس بھی اختلافات سے مبرا نہ تھے —— عہدِ رسالتؐ ہو' یا دورِ خلافتِ راشدہ' اجتہاد و استنباط کا معاملہ ہو یا تدبیر کا' سیاسی مسائل ہوں یا فقہی و کلامی' خیالات و نظریات عنوان ہوں یا ذوات و شخصیات۔ اوس و خزرج کی چشمک' سقیفہ بنی ساعدہ' باغِ فدک' خلافت و شہادت سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ' جنگِ جمل و صفین' واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرہ —— یہ سب اسی حقیقت کے عکاس ہیں۔ اس کے بعد اصحاب رائے اور اہلِ حدیث' ابو حنیفہؒ اور بخاریؒ' غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ کے درمیان اختلاف جیسے اختلاف بھی ہوئے جو آج تک مدرسوں کی زینت ہیں۔

جماعت اسلامی میں بھی تشکیل کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ چند ایسے اختلافات "ابتدائی مرحلہ ہی میں... نظامِ جماعت کے اندر رونما ہو گئے تھے... جن کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ

کہیں اقامتِ دین کی یہ منظم کوشش، جو ایک صدی کے تعطل کی بعد بمشکل شروع ہوئی [تھی]، شروع ہوتے ہی ختم نہ ہو جائے" اور جن کی وجہ سے "تفرق واختلاف اور بد دلی اور بد گمانیوں کا زہر دور و نزدیک کے ارکان میں بالعموم پھیلنا شروع ہو گیا [تھا] سب جانتے ہیں کہ اس اختلاف، تفرق، بددلی اور بد گمانی کی بنیاد اس وقت کے امیر کی ذات تھی کہ جن سے اور جن کے کام سے چند نامور بانی ارکان مطمئن نہیں تھے، اور جن کو وہ جماعتِ اسلامی جیسی دینی تحریک کی امارت کے لیے غیر موزوں اور نا اہل سمجھتے تھے۔ اس اختلاف کے نتیجہ میں چند بانی ارکان، جماعت کو چھوڑ گئے، مگر سفر جاری رہا۔

ایک اور مثال قیامِ پاکستان کے واقعات کے بعد کی ہے، جب امیرِ جماعت نے اعلان کیا کہ "اب تیسرا مرحلہ شروع ہے ... (جو) توسیع و عملی اقدام کا ہے"۔ اب جماعت نے عملی سیاست میں حصہ لیا، انتخابات میں شرکت کی، امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ اختیار کیا، سیکولر عناصر سے اتحاد کیے، جلوس نکالے، جھنڈے اٹھائے، مظاہرے کیے، ریزولیشن پاس کیے، استقبالیے دیے، تھیلیاں پیش کیں، گرم گرم تقریریں کیں اور تحریریں لکھیں، غلافِ کعبہ کا جلوس نکالا، تصویریں شائع ہوئیں۔ ان تبدیلیوں اور اقدامات سے بھی اختلاف ہوا، بے اطمینانی پیدا ہوئی، افتراق و انتشار کی شکل بنی، الزام بازی ہوئی —— اور پھر جائزہ کمیٹی بنی —— پھر ماچھی گوٹھ کا اجتماع ہوا۔ اس دور میں کن کن آرا، تاثرات، احساسات اور الزامات کا اظہار کیا گیا؟ چند نمونے دیکھیے: جماعت کی "ہیئت اور نوعیت ہی کو سرے سے بدل کر رکھ دیا"۔ پہلے اور دوسرے "ادوار کو ایک ہی تحریک کے دو مراحل کہنا ناممکن ہے"۔ "جو باتیں وہاں غلط ٹھہرائی گئی تھیں انھیں یہاں باقاعدہ اختیار کیا گیا"۔ جماعت اسلامی کو "ایک سیاسی جماعت کے نقشے پر ڈھال دیا"۔ "کارکن ایک سیاسی جماعت کے کارکن معلوم ہوتے ہیں"۔ سیرت و اخلاق و کردار کا سرمایہ "ختم ہونے پر آ رہا ہے"۔ "پورے ۹ سال تک دعوت کا کام حقیقتاً" بند رہا"۔ "خرچ میں اب ... احتیاط اور ... احساسِ ذمہ داری بھی باقی نہیں رہا"۔ اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ "عجلت پسندی"۔ "غصہ میں آپ نے دستور و آئین اور حق وانصاف سب کو لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا"۔ "شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف آپ کا یہ اقدام"۔ "شوریٰ کے ختم ہوتے ہی آپ نے ... شوریٰ کے فیصلہ کو الٹ دیا"۔ جماعتِ اسلامی کے امیر نے ایک آمرِ مطلق کی تلوار سنبھال لی۔ "وہ بالکل سیاسی طرز پر سوچنے اور اسی طور پر کام کے نقشے بنانے لگے۔ ان کے اقدار اور پیمانے بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگے۔" اسی طرح استعفے اور بیانات اخباروں کی شہ سرخی بھی بنے، کالموں کا موضوع بھی۔

جماعت نے ان سارے الزامات کو رد کر دیا۔ان کی زد یالی جماعت کی ذات پر تھی' لیکن ہم نے یہ سارے فقرے صرف اس لیے نقل کیے ہیں کہ ہم خیالی جنت سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھیں' اور یہ پہچانیں کہ جب اختلاف پیدا ہو تو کیا کچھ سمجھنا' یقین کرنا اور کہنا ممکن ہو جاتا ہے۔ ان اختلافات نے جماعت کو جس صورتِ حال سے دو چار کیا' اس کا کچھ اندازہ اس وقت کے قائم مقام امیرِ جماعت' چودھری غلام محمدؒ کے جاری کردہ سرکلر نمبر ۱۱۔۳ الف۔ ۲۷' مورخہ ۱۶ جنوری ۵۷ء سے کیا جاسکتا ہے:

> ہماری جماعتی زندگی میں بعض ایسے واقعات نمودار ہوئے جن کے واقع ہونے کی توقع نہ ہم کو تھی اور نہ جماعت سے باہر کے لوگوں کو تھی۔ ان واقعات سے بعض جگہ جماعت کا داخلی استحکام بھی متاثر ہوا ہے اور باہر کے لوگوں کی نگاہوں میں بھی ان سے جماعت کا وقار مجروح ہوا ہے۔ جو لوگ ہم سے حسنِ ظن رکھتے تھے اور اس ملک کی اصلاح سے متعلق ہم سے امیدیں قائم کیے ہوئے تھے ان پر دل شکستگی اور مایوسی طاری ہوئی ہے' اور جن کو ہم سے مخالفت تھی ان کو خوش ہونے اور ہمارے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا کافی مواد چند ہفتوں میں ہاتھ آیا ہے۔
>
> ... جو کچھ پیش آیا ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس کے پیش آنے کے لیے فی الواقع کوئی وجہ موجود تھی۔ اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کے پیش آنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی موجود نہیں تھی۔ بلکہ چند لوگوں کی محض ناسمجھی' بے احتیاطی اور بدگمانی نے اس کے اسباب فراہم کردیے ہیں۔ بعض لوگوں نے شوریٰ کی کارروائیوں کے متعلق بالکل غلط اور بے بنیاد تاثرات دیے۔ بعض لوگوں نے قرار داد کے متن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو اس کی منشا کے خلاف تھی۔ بعضوں نے شوریٰ کے ارکان کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا... بعض مقامات پر ذمہ داروں نے اپنے حقوق و اختیارات کے استعمال میں جلد بازی اور بے احتیاطی سے کام لیا۔ اس طرح بعض نے شدتِ تاثر میں اپنے جذبات پبلک پر ظاہر کردیے۔ ان ساری باتوں نے مل ملا کر چند دنوں کے لیے جماعت کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ لوگوں کے ذہن ہر طرح کی باتیں قبول کرنے اور ہر طرح کی باتیں پھیلانے کے لیے بالکل بے قید ہوگئے اور شریعت اور اخلاق کے حدود کی بھی پروا بہت کم ہوگئی۔

اختلاف کا پیدا ہونا' اس کا افتراق و انتشار کی شکل اختیار کر لینا' فتنہ اور فساد بن جانا' کوئی

ضروری و ناگزیر حادثہ نہیں' لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے' اب بھی ہو سکتا ہے' آئندہ بھی ہوگا۔ فتنہ پیدا ہونا کیوں ممکن ہے' کیوں کر پیدا ہوتا ہے' کیوں کر پروان چڑھتا ہے' اور کس طرح اچھے اچھے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے' اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں محترم نعیم صدیقی کے چند الفاظ ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہئیں۔ واقعہ افک کا ذکر کرتے ہوئے وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ "طوفانِ عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظامِ جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟"۔ پھر وہ یوں جواب دیتے ہیں:

... نظامِ مشیت جس نقشے پر گامزن ہے' اس میں شیطان کے لیے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضرور باقی رہتے ہیں' خواہ کیسی ہی مثالی اسلامی سوسائٹی کیوں نہ ہو' درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبیؐ کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اس کے دائرے میں فتنہ کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا... ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جاسکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت کرتا ہی نہ دکھائی دے گا بلکہ حملہ آور جراثیم کو ہلاک کرکے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا ہی نہیں ہوگا۔

شیطان کے لیے ایک معاشرہ میں سازگار ترین فضا نجویٰ کی فضا ہوتی ہے... نجویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات' مشوروں' تنقیدوں' اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔

(محسنِ انسانیت' ص ۲۷۹۔ ۲۸۰)

پھر وہ مزید کہتے ہیں:

ایک دینی و اخلاقی نظامِ جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام اور قیادت کے خلاف تحقیر کا طوفان اٹھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم چلاتا ہے' وہ درحقیقت سرے سے اس کی حرکت' اس کے اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے...

دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی بڑا موڑ پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں' تو اس تغیر کا فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہوجاتا ہے ـــــ ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں میں پڑ کر بددلی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ (ایضاً" ص ۲۸۴)

ایک دینی تحریک کے اخلاقی نظامِ جماعت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

اخلاقی نظامِ جماعت کی ایک خاص پیچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابلِ گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر کے سامنے نہ آجائیں' ان پر نہ جماعت گرفت کرسکتی ہے' نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل بر سرِ عام لاسکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظامِ جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے خلاف سوئے ظن سے روکتا ہے اور ایک مخلص آدمی آخری حد تک مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرزِ عمل کے ہر جزو کی بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے...

محض تاثرات ---- چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں ---- اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمے کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لاکر نظم کو متحرک کیا جائے...

دوسری پیچیدگی اخلاقی جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے سربراہِ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے اہلِ حل و عقد اور اربابِ امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے... اگر وہ اربابِ فتنہ کا پول پوری جماعت کے سامنے کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دباتے ہیں اور آوازۂ حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں...

اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر چلنے نہ دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوش ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو اِدھر اُدھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے۔ گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں' ان کو پھیلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہوسکتا۔ (ایضاً" ص ۲۷۸-۲۸۸)

واقعہ افک پر قرآن کے کلام اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

بتایا جا رہا ہے کہ تمھارے جماعتی ماحول میں یہ کمزوری موجود ہے کہ اس کے معمار ہی اس کی تباہی کی مہم چلا دیں۔ اس فضا میں ایسے رخنے موجود ہیں کہ علمبردارانِ صداقت کی سوسائٹی میں جھوٹ برگ و بار لائے...

یہ کسی بھی معاشرے اور کسی بھی نظامِ جماعت کی ـــــ خصوصاً" جب وہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح کے لیے قائم ہوا ہو اور اس کے زیرِ اثر ایک تمدنی و سیاسی تحریک چل رہی ہو ـــــ بڑی بھاری کمزوری ہے کہ اس میں بے سروپا اور بے ہودہ اور غیر ذمہ دارانہ باتوں کا آسانی سے چلن ہو سکے۔ کان جو کچھ سنیں' اٹھا کر دل میں رکھ لیں اور دل زبانوں کے حوالے کر دیں اور زبانیں آگے منتقل کرتی چلی جائیں۔ کوئی غور و تامل نہ ہو۔ کوئی تحقیق نہ ہو۔ کوئی ردّ و کد نہ ہو اور کسی جگہ جا کر سلسلہ رکے نہیں۔ جو جس شخص کے خلاف جیسے کلمات بھی کہتا جائے' بالکل چھوٹ ہو' جو جس کی پگڑی اچھالنا چاہے اسے پوری آزادی ہو اور جو جس کے دامن عفت کی دھجیاں بکھیرنا چاہے ماحول اسے وسیع موقع بہم پہنچا دے۔ اچھا چمن افکار و کردار ہو گا جس میں فتنہ کا مالی کانٹے بوتا رہے اور زبانوں کی کیاریاں کانٹے اگاتی رہیں۔ (ایضاً" ۲۹۶ ـ ۲۹۹)

ایک بڑے اہم پہلو کی طرف وہ یوں توجہ دلاتے ہیں:

اس بحران میں ان [حسان بن ثابتؓ] کا ـــــ اپنی جگہ مخلصانہ' مگر تحریک کے لیے نہایت مضر ـــــ پارٹ دیکھ کر آدمی یہ درسِ عبرت حاصل کرتا ہے کہ نہ کوئی بہتر سے بہتر شخص اپنے بارے میں یہ ضمانت رکھتا ہے کہ وہ مغالطے کے کسی چکر میں نہ پڑے گا اور نہ دوسری نمایاں ترین شخصیتوں کے بارے میں وہ بے فکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فتنے کے گھیرے میں نہ آئیں گی۔ ہر انسان' بڑا ہو یا چھوٹا ہر وقت شیطان کی کمان سے نکلنے والے تیروں کی زد میں ہے۔ بلکہ فتنے ہر اہم اور بڑے آدمی کے گرد گھیرا ڈالنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں . . .

. . . یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تحریک کے لیے عبداللہ بن ابی کا نفاق اتنا خطرناک اور مضر نہ تھا' جتنا حسان بن ثابتؓ کا اخلاص! جو اقدام اخلاص اور نیک نیتی سے کیے جاتے ہیں وہ ضرر رسانی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں' بمقابلہ ان اقدامات کے جو دانستہ شرارت کے طور پر کیے جاتے ہیں۔

حسان بن ثابتؓ اس بات کا احساس نہ کر سکے کہ وہ کن لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں' وہ کیسے افراد کا نقطہ نظر پھیلا رہے ہیں اور ان کے حرکات و سکنات معاشرے میں کس عنصر کی حمایت میں جا رہی ہیں . . .

عبداللہ بن ابی کے ساتھ اسلامی معاشرے کا معاملہ دوری اور بیگانگی کا تھا۔ اس کی کلوخ

اندازی قابل برداشت تھی' لیکن حسان بن ثابتؓ سے جماعت کی جو یگانگت تھی' اس کی وجہ سے جذبات میں کھولاؤ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے نیام کی ایک تلوار ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہے' یہ صورت جب کسی تحریک اور تنظیم میں پیدا ہوتی ہے تو صبر کے پیمانے لبریز ہوجاتے ہیں (ایضاً" ص ۲۹۹۔ ۳۰۰)

اقتباسات طویل ہوگئے ہیں' لیکن اس سے زیادہ روشن اور پُر اثر رہنمائی اور کہاں سے مل سکتی تھی۔

ایک انسانی گروہ میں اختلاف کا پایا جانا فطری ہے' اس کا فتنہ بن جانا ممکن۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم اصولی حقیقت یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک انسانی جماعت ہے' انسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے امراء بھی انسان ہیں اور مامورین بھی۔ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔ عجلت پسندی اس کے خمیر میں ہے' نسیان و غفلت اور ضعفِ ارادہ اس کی ساخت میں مضمر ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس امتحان کے لیے ناگزیر ہیں جس امتحان کے لیے اسے کرہ ارض پر خلیفہ بنایا گیا ہے اور عمل میں اختیار اور آزادی دی گئی ہے' تاکہ وہ اپنے کارنامۂ حیات کے لیے مسئول ہوسکے' اور جنت کا مستحق بن سکے۔ اختیار کی آزادی مستلزم ہے اس امر کی کہ وہ ظالم و جاہل بن سکتا ہے' فساد مچا سکتا ہے' دوسروں کے خون' (مال' اور عزت) پر بلا استحقاق اور بلا جواز ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اس کو لغزش' خطا اور گناہ کی طرف دعوت دینے والی قوتیں اس کے آگے پیچھے' دائیں بائیں' گھات میں لگی ہوئی ہیں' یہاں تک کہ انبیاء کی گھات میں بھی۔ کوئی انسان جو جماعتِ اسلامی میں شامل ہو جائے' اس کے تربیتی نظام سے گزر جائے' اس میں ایک عمر گزار دے' اس کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہوجائے' وہ مقامِ انسان کی ان کمزوریوں اور امتحان سے مامون و مصئون نہیں ہوسکتا' نہ اس بات کی ضمانت دی جاسکتی ہے کہ وہ اس دشمن کے کید کا شکار نہ ہوگا' جو ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہے' اور خون کی طرح اس کی رگوں میں گردش کر رہا ہے' یا وہ غلطی نہیں کرے گا' اور اس سے گناہ سرزد نہیں ہوگا' (کہ مقامِ عصمت صرف انبیاء کے لیے ہے)' اور اگر ہو جائے تو اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ اس کے لیے جماعت ذمہ دار ہو' مسئول ہو' اور مطعون کی جائے۔ الّا یہ کہ وہ اپنے تعلیم و تذکیر کے فریضہ سے غافل ہو' اور امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور اصلاحِ احوال کے فریضہ کی تارک' یا وہ منکر کو معروف قرار دینے لگ جائے۔

چنانچہ کل کے اختلافات ہوں یا آج کے' یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک عام کارکن بھی

غلطیاں کرسکتا ہے' امیرِ جماعت بھی' اور شوریٰ بھی --- اور کی ہوں گی۔ امیرِ جماعت بھی غلط فیصلے کرسکتا ہے' پوری شوریٰ بھی' اور جماعت بھی --- اور کیے بھی ہوں گے۔ یہ غلطیاں تدابیر کے باب میں بھی ہوسکتی ہیں' اور احکامِ الٰہی کے بارے میں بھی' فہم و استنباط کی بھی ہوسکتی ہیں اور عمل کی بھی۔ اس اہم حقیقت کا ادارک ہی اختلاف کو افتراق و انتشار میں تبدیل ہونے سے روک سکتا ہے۔ اس بات سے اس سے زیادہ کون واقف ہوسکتا تھا جس نے "تجدید و احیائے دین" اور "خلافت و ملوکیت" جیسی کتب تحریر کیں۔ اسی لیے اس نے روزِ اوّل سے خود کو بھی احتساب کے لیے پیش کیا' اور جماعت میں بھی احتساب کا نظام قائم کرنے اور رکھنے کا انتظام کیا۔ اسی لیے تاسیسِ جماعت کے وقت سے ہی' سیّد مودودیؒ نے اس بات کا اہتمام بھی کیا کہ جماعتی زندگی کے آداب و احکام کا التزام کیا جائے' اور ایسے دستور' قواعد اور روایات پر کاربند رہا جائے جن کے ذریعہ فتنہ کی راہیں مسدود ہوسکیں۔

اللہ اور اس کے رسولؐ نے باہمی تعلقات' جماعت کے ساتھ تعلق' اور امیر اور مامورین کے درمیان تعلق کے باب میں جو احکام دیے ہیں' جن امور کو حرام کہا ہے' اور جن امور کے التزام کی ہدایت کی ہے' ان سے سب ہی واقف ہیں۔ اگرچہ عام حالات میں بھی ان پر عمل کم ہی ہوتا ہے' مگر جب اختلاف اور فتنہ کی فضا پیدا ہوجائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو بالکل ہی فراموش کردیا جاتا ہے۔ حالانکہ "افرادِ جماعت سے کینہ' بغض' حسد' بدگمانی اور ایذا رسانی وہ بد ترین جرائم ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایمان کے منافی قرار دیا ہے" ' اور "اسی طرح غیبت اور تنابز بالالقاب اور بدظنی بھی جماعتی زندگی کے لیے سخت مہلک بیماریاں ہیں۔"

فتنہ کے بڑے بڑے اسباب یہ چند ہی ہیں۔ نیت کے بارے میں سوئے ظن قائم کرنا (حالانکہ دلوں کے بھید صرف علّام الغیوب جانتا ہے)۔ اقوال و اعمال کی بُری سے بُری تاویل کرنا۔ اپنے سوئے ظن یا سنی سنائی باتوں کو بلا تحقیق یقین کا درجہ دینا' صرف یقین کا درجہ ہی نہ دینا بلکہ ان کو بلا تکلف نقل کرتے پھرنا' حالانکہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سنی سنائی باتیں بلا تحقیق نقل کرتا پھرے' پھر اس مہم میں اشاروں اور کنایوں اور کھلے الفاظ سے غیبت' تمسخر' عیوب کی پردہ دری' تحقیر' چغلی جیسے گھناؤنے حرام کاموں میں ملوث ہونا' یہ عیوب ایک صالح نظامِ جماعت میں بھی کتنے عام ہوسکتے ہیں' اس کا نظارہ آج بھی چشمِ سر سے کیا جاسکتا ہے' اور چودھری غلام محمد صاحب مرحوم کے اس سرکلر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جس کا کچھ حصہ اوپر

نقل کیا جا چکا ہے۔

"جماعت بغیر امارت کے نہیں ہے" اور "باہمی مشاورت جماعتی زندگی کی جان ہے" ——
یہ دو اصول جماعت کی بنیاد ہیں' لیکن امارت اور مشاورت کے درمیان صحیح تعلق اور توازن ہر جماعتی زندگی کا اہم اور نازک مسئلہ رہا ہے' اور ہے' اور اس باب میں آویزش اور عدم توازن اختلاف کو فساد اور فتنہ میں بدل دینے کا بہت بڑا سبب۔ امیر آمر بھی بن سکتا ہے' اور شوریٰ امیر کو بے دست و پا بھی کر سکتی ہے۔ کوئی دستوری و قانونی ضوابط اس مسئلہ کو حتمی طور پر حل نہیں کر سکتے۔

ایک طرف یہ بات بھی صحیح ہے جیسا سید مودودیؒ نے فرمایا کہ: "تحریکیں اس طرح نہیں چلا کرتیں کہ جماعت فیصلے کر کے لیڈر کے حوالے کر دے' اور لیڈر صاحب اپنے سیکرٹریٹ اور انتظامی عملہ کے ذریعے سے ان کو نافذ کر دیا کریں۔۔۔ کوئی کمانڈر دیے ہوئے نقشوں پر نہیں لڑ سکتا۔۔۔ وہ ہر وقت کونسلیں بلا کر اور ان سے پوچھ پوچھ کر کام نہیں کر سکتا۔۔۔ آپ کو جب تک پورا اعتماد نہ ہو اسٹیئرنگ وہیل کسی کے ہاتھ میں نہ دیجیے' مگر جب آپ اسے کسی کے حوالے کر دیں تو پھر پورے اعتماد کے ساتھ ایسا کریں۔ بندھے ہوئے ہاتھوں سے کوئی شخص ایک معمولی گاڑی تک نہیں چلا سکتا' ایک تحریک کیسے چلا سکتا ہے"۔ اور ان کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ "کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اس کو ایک شخصیت لے کر چلے۔۔۔ جس کو بھی کسی مقصدِ عزیز کے لیے کوئی تحریک چلانی ہو' اسے دل کی آمادگی کے ساتھ' یا سینہ پر پتھر رکھ کر' ایک شخصیت گوارا کرنا پڑے گی' بلکہ خود بنانا اور دوسروں سے بنوانا پڑے گی۔"

دوسری طرف یہ بات بھی بالکل صحیح ہے' جیسا کہ محترم نعیم صدیقی نے لکھا ہے کہ: "جماعت کے اصل تشخص کو برباد کر کے آمریت کی راہ پر چلنے کے لیے مجھے یا آپ کو کون سی چیزیں روک سکتی ہیں۔ دورِ خلافتِ راشدہ کو سامنے رکھیے۔ آخری دور میں ایک طرف حضرت علیؓ خلیفہ راشد ہیں۔ دوسری طرف امیر معاویہؓ ڈٹے ہوئے ہیں۔ قرآن موجود' حدیث موجود' عملی روایات موجود' صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد موجود' مگر فتنہ حل نہ ہو سکا"۔

اسی لیے سید مودودیؒ نے جب جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی کے فرض کے لیے پکارا تو یہ آواز بھی بلند کی کہ اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے' اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بُت نہ بننے دیا جائے' اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔

ساتھ ہی اس مقصد کے لیے انہوں نے تاکید کی کہ: "جس شخص کے سپرد کسی جماعتی کام

کی ذمّہ داری' ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے کاموں میں دوسرے رفقاء سے مشورہ لے" اور یہ کہ "یہ اس کا فرض ہے کہ جو قدم بھی اٹھائے' پوری جماعت کو اس پر مطمئن کرے' کیوں کہ جماعت ہی کا اطمینان تو وہ اصل طاقت ہے' جس کے بل پر وہ تحریک کو چلا سکتا ہے"۔

مگر مشاورت کوئی یک طرفہ عمل یا ذمّہ داری نہیں جو صرف امراء پر عائد ہوتی ہو۔ اصحابِ مشورہ پر بھی برابر کی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اور اگر وہ یہ ذمّہ داریاں کما حقہٗ ادا نہ کریں تو ان کا یہ عمل ایک صالح نظام میں فساد پیدا کر سکتا ہے۔ ان ذمّہ داریوں کو بھی سیّد مودودیؒ نے واضح کر دیا ہے:

جس شخص سے مشورہ لیا جائے اس کا فرض ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کرے۔

جو شخص اجتماعی مشاورت میں اپنی صوابدید کے مطابق رائے دینے سے پرہیز کرتا ہے وہ جماعت پر ظلم کرتا ہے' اور

جو کسی مصلحت سے اپنی صوابدید کے خلاف رائے دیتا ہے وہ جماعت کے ساتھ غدر کرتا ہے' اور

جو مشاورت کے موقع پر اپنی رائے چھپاتا ہے اور بعد میں جب اس کی منشا کے خلاف کوئی بات طے ہو جاتی ہے تو جماعت میں بد دلی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے وہ بدترین خیانت کا مجرم ہے۔

کسی شخص کو اپنی رائے پر اتنا مصرنہ ہونا چاہیے کہ یا تو اس کی بات مانی جائے ورنہ جماعت سے تعاون نہ کرے گا یا اجماع کے خلاف عمل کرے گا۔ [اس طرح] آخر کار پورا نظام جماعت درہم برہم ہو جائے گا۔

ان مختلف' اور بظاہر متضاد تقاضوں اور اصولوں کے درمیان: "صحیح توازن ہی پر ہماری کامیابی کا انحصار ہے"۔ ان سب کو ملحوظ رکھنے اور ان سب کے درمیان توازن رکھنے کی جو کوشش انسان کے بس میں ہے اسی نے جماعت' دستور' قواعد' اور روایات کی شکل اختیار کی ہے۔ اس لیے ہر رکن' ہر رکنِ شوریٰ اور ہر امیر' اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت و وفاداری کے بعد' اور اس کے تحت' جماعت کے دستور کی پابندی اور وفاداری کا عہد کرتا ہے۔

جماعت کو راہِ راست سے نہ ہٹنے دینے' اس کے رخ اور پٹڑی کو بدلنے سے روکنے' جماعت میں غلط مقاصد اور غلط خیالات اور غلط طریقوں کو پھیلنے سے روکنے' اور دستور کی پابندی

کرانے کے لیے' اگرچہ جماعت کا ہر رکن ذمّہ دار ہے' لیکن خاص طور پر ہر رکنِ شوریٰ بلا مداہنت اپنی حقیقی رائے کے صاف صاف اظہار' اور جہاں کہیں خرابی محسوس کرے' اسے دور کرنے کی پوری کوشش کرنے کے عہد کا پابند کیا گیا ہے۔ اگر کوئی امیرِ جماعت' جماعت کو راہ راست سے ہٹانے' یا اس میں غلط طریقوں کو رائج کرنے یا دستور کی خلاف ورزیاں کرنے کے جرائم کا ارتکاب کرے تو یہ ذمّہ داری پھر ارکانِ شوریٰ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ بلا مداہنت اس کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک مجلس کے اجلاس میں پیش کریں' اور مجلسِ شوریٰ کو اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ اگر ان الزامات کو صحیح پائے' تو اسے معزول کردے۔

ساتھ ہی ارکان اور ارکانِ شوریٰ کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف ان اخلاقی ہدایات کی پابندی کریں' جو مؤسس جماعت سیّد مودودیؒ نے آغاز ہی میں دے دی تھیں' بلکہ اپنی رائے کے صاف صاف اظہار اور خرابیوں کی اصلاح کی کوششوں کے لیے وہی طریقے' مجالس اور پلیٹ فارم استعمال کریں جو دستور نے طے کردیے ہیں۔ پریس اور پبلک پلیٹ فارم کو ذریعہ بنا کر' یا فرداً فرداً ارکانِ جماعت میں نجویٰ کرکے دستور کی خلاف ورزی نہ کریں۔ پھر جو فیصلے جماعت میں کثرتِ رائے سے ہوجائیں' ان کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے' ان کو تسلیم کرلیں۔ ایک خرابی یا غلطی کے ازالہ کے لیے دوسری غلطی کرنے سے' غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ غلطی دگنی ہوجاتی ہے' اور خرابی اور فتنہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ دستور کی خلاف ورزی کا ازالہ کرنے کے لیے دستور ہی کی خلاف ورزی کرنے سے دستور کے بگاڑ میں اضافہ ہوگا' کمی نہیں۔ اگر جماعت کی منتخب مجلسِ شوریٰ' اللہ رب العالمین کو گواہ کرکے عہد کرنے کے باوجود' خرابیوں کا ازالہ کرنے' اور دستور کی خلاف ورزیاں روکنے یا ان کے خلاف اقدام کرنے سے قاصر رہتی ہے' تو پھر یہ ایک المیہ سے کم نہیں۔ اگر یہ ان کی اپنے فرض سے روگردانی کی وجہ سے ہے' تو اصلاح کی شاید کوئی دوسری صورت ممکن نہیں' اور اگر یہ اس لیے ہے کہ دستور میں تجویز کردہ انتظامات اب اصلاح کے لیے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں' اور اس لیے مصلحین کو غیر دستوری ذرائع کا رخ کرنا پڑ رہا ہے' تو انہیں' اور خود جماعت کو اپنے نظام و دستور پر نظرِ ثانی کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

اس طرح جہاں ہر امیرِ جماعت کے اختیارات میں یہ شامل ہے کہ وہ تحریک کے لیے ضروری بیانات دے اور اقدامات کرے' وہاں اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ جماعت کو ان پر مطمئن کرے۔ اگر بے اطمینانی پھوٹ کر باہر نکل رہی ہے اور فتنہ سر اٹھا رہا ہے تو' اگرچہ یہ نظم و

اخلاق کی کوتاہی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے' اور اس پر اس کو نصیحت و تادیب کا پورا حق ہے' اس کے لیے یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اسے کیا اقدامات کرنا ضروری ہیں' اور وہ یہ اقدامات کرے۔ اسے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ (اپنے رب کی حمد کرو اور اپنے گناہوں پر استغفار کرو)' وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ (اور اپنی نگاہوں کو ان سے نہ ہٹاؤ)' فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (ان کو معاف کردو' ان کے لیے استغفار کرو' اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو)' بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (مومنین کے لیے رؤف و رحیم!) جیسی آیات میں بیان کردہ اسوہ کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے۔

اختلاف سے تو کسی انسانی گروہ یا جماعت کو مفر نہیں۔ لیکن فتنہ اور فساد سے بچنا ممکن ہے' اور ضروری بھی۔ اختلاف اگر خالصتاً للہ ہو' نیک نیتی سے ہو' صحیح حدود میں ہو' اس میں مطلوبہ آداب کی پابندی کی جائے' وسعتِ ظرف اور رواداری کے ساتھ ہو' سبّ و شتم اور کبر و تحقیر سے پاک ہو' تواضع اور جذبۂ تعلیم و تعلم اور کسرو انکسار کے ساتھ ہو' اصرار و عناد سے خالی ہو' تو وہ جماعت کی تقویت اور وسعت و استحکام کے لیے ناگزیر ہے۔ جب احکام و حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی ہونے لگتی ہے تو اختلاف' تنازع بن جاتا ہے۔ تنازع سے فتنہ اور ضعف پیدا ہوتے ہیں' اور ہوا اکھڑنے لگتی ہے۔ لیکن فتنہ بن جانے کے بعد بھی اگر بروقت انتباہ ہو' تذکیر ہو' تعلیم ہو' خود احتسابی اور استغفار ہو' اصلاح و درستگی ہو' تو فتنہ سے خیر پیدا ہو سکتا ہے' اور فتنہ کی بھٹی سے جماعت زیادہ طاقتور بن کر نکل سکتی ہے۔ جیسا کہ واقعہ افک کے موقع پر فرمایا گیا کہ "اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو' بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے" (النور : ۱۱)۔ "واقعہ یہ ہے کہ اصولی و انقلابی تحریکوں کے لیے ذہنی شکست و ریخت کے ہنگامے خواہ باہر سے اٹھیں' خواہ اندر سے ـــــ انجام کار کے لحاظ سے مزید فلاح و ترقی' تعمیر و اصلاح اور قوت و سطوت کا باعث بن کر رہتے ہیں" (محسنِ انسانیت : ص ۳۰۴)

صرف چند ہی باتیں ہیں ـــــ ان پر پابندی سے عمل کرنا ایسا دشوار بھی نہیں ـــــ اگر ہم یہ عزم و عہد کرلیں کہ آج کل کے دوران بھی' اور آئندہ کے لیے بھی' ان کی مکمل پابندی کریں گے' اور سرِمو ان کی خلاف ورزی نہ کریں گے' تو نہ صرف وہ بادل چھٹ جائیں گے جو اس وقت چھائے ہوئے نظر آتے ہیں' بلکہ ہماری جماعتی زندگی کے وہ بے شمار روگ بھی دور ہو جائیں گے

جن کا ہم کو شدت سے احساس ہے، لیکن جن کے لیے ہم کچھ نہیں کر پا رہے ہیں،

۱۔ اپنی کسی بھی رائے کو کبھی بھی حرف آخر نہیں سمجھیں گے، اور اس کے غلط ہونے کے امکان کو بھی اسی طرح تسلیم کریں گے جس طرح اس کے صحیح ہونے کے یقین کو۔

ایسا حرفِ آخر، جس کے غلط ہونے کا کوئی امکان نہ ہو، صرف لفظِ الٰہی ہی ہو سکتا ہے، لفظِ الٰہی کی کوئی انسانی فہم و استنباط بھی نہیں۔ اس اصول پر عمل ہو تو اپنی رائے کے مانے جانے پر اصرار، اور نہ مانے جانے کی صورت میں غلط راہوں کی طرف فرار ختم ہو جائیں گے۔ انکسار، تواضع، حلم اور رواداری جنم لیں گے۔

۲۔ کسی کی بھی نیت، قول اور فعل کے بارے میں بلا ثبوت کوئی سوئے ظن قائم نہیں کریں گے۔

دوسروں کے بارے میں دلوں میں پلنے والی، زبانوں پر آنے والی، تکدر و کینہ پیدا کرنے والی بیشتر خراب خیالات و آرا کی جڑ اسی ایک اصول سے کٹ جائے گی۔

۳۔ کسی کے بارے میں بھی کوئی بری بات جو کان سنیں گے، اسے اٹھا کر بلا تحقیق و ثبوت ہرگز دل میں نہیں رکھیں گے، اور زبان و قلم کے حوالے تو ہرگز بھی نہیں کریں گے، نہ آگے نقل کرتے چلے جائیں گے۔

بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ کہنا ایک گناہ ہے جس سے فساد رونما ہوتا ہے۔ اس ایک اصول کی پابندی اسی فساد ذات البین کی جڑ کاٹ دے گی جو سارے دین کو مونڈ دیتا ہے۔

۴۔ جو بات منہ سے نکلے گی، زبان سے ہو یا قلم سے، قول لین (نرم بات) ہوگی، دوست کے لیے ہو یا دشمن کے لیے۔

لینتِ قلب (دل کی نرمی) تو انسان کے اختیار میں نہیں، قول میں عدل کی پرکھ بھی ہر کسی ر کے بس کی بات نہیں، لیکن قول لین ہمارے اختیار میں بھی ہے، اور اس کی پرکھ بھی آسان ہے۔ ئے جو ایسی بات نہ کہہ سکتا ہو کہ خیر ہو، اور خیر کا باعث، وہ پھر خاموش رہے۔

۵۔ کسی کا بھی ذکر اس کی غیر حاضری میں کسی بھی مجلس میں، بلا جواز یا

بلا امکانِ اصلاح' اس طرح نہیں کریں گے کہ وہ سنے تو اس کو برا لگے۔

غیبت' سود اور زنا سے زیادہ گھناؤنا گناہ ہے۔ مسلمان بھائی کے مردار گوشت کی لذت ہی سے نجویٰ کی محفلیں سجائی جاتی ہیں' اور مقبول ہوتی ہیں۔

۶۔ اختلاف کرسکتے ہیں' لیکن تنازع سے مکمل اجتناب کریں گے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے "وَلَا تَنَازَعُوا" کہہ کر حرام کردیا ہے۔

تنازع سے بچنے کا کوئی گر اس کے علاوہ نہیں کہ ہم خلاف طبع و رائے باتوں پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کے عادی ہوں' اور اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑیں کہ اس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھیں۔ دوسرے کی بات مان لینا اگر عقل و دیانت کے خلاف ہو' تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے سکوت اختیار کرلینا تو بہرحال اختیار میں ہے۔

۷۔ ان میں سے جس اصول کی خلاف ورزی جب بھی ہو' اس پر استغفار۔

اختتام میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سارے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں' وہ ان کو جس طرح چاہے الٹ پلٹ سکتا ہے۔ مختلف انسانوں کو جوڑ کر ایک قوی جماعت بنانا' اور بنائے رکھنا' کس درجہ کا کام ہے۔ اس کا اندازہ ان آیات سے ہو سکتا ہے'

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (الانفال ۸ : ۶۲' ۶۳)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے' اور مومنوں کے ذریعہ سے' تمہاری تائید کی' اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے' مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے' یقیناً" وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔

اقول قولی ھذا و افوض امری الی اللّٰہ۔ ان اللّٰہ بصیر بالعباد

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

اللھم الف بین قلوبنا واصلح ذات بیننا واھدنا سبل السلام

دعوت کے کام کے لیے شخصی اوصاف

مجاہدۂ نفس

شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنائے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ۔ "حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے۔"

یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لیے نکلیں، اس باغی کو مطیع بنایئے جو خود آپ کے اندر موجود ہے، اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے، اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ ایک بالکل بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لیے تباہ کن ہے، پہلے خود خدا کے آگے سر جھکایئے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجیے۔

ہجرت وسیع معنیٰ کے لحاظ سے

جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑنا نہیں ہے بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے۔ اصلی مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کے وطن میں قانونِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرماں برداری اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔

یہ حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کردی گئی ہے۔ بطور مثال ایک حدیث کو لیجئے' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ :

ما الہجرۃ افضل یا رسول اللہ۔ "یا رسولؐ اللہ کون سی ہجرت بہتر ہے"۔

جواب ملا :

ان تہجر ما کرہ ربک۔ "یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں"۔

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترکِ وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیے اور اصطلاحی کفار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنایے۔ اس معنی کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ حدیثِ نبویؐ کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنایے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور وہ کتنا ہی گھومے پھرے' ہر حال میں اس حد سے آگے نہیں جاسکتا جہاں تک رسی اسے جانے دیتی ہے : **مثل الایمان کمثل الفرس فی آخیتہ یجول ثم یرجع الی آخیتہ**۔ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے' ہر کھیت میں گھس جاتا ہے' اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں' اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم یہ اٹھایے کہ اپنے قریبی ماحول سے' جسے میں "ہوم فرنٹ" کہوں گا' لڑنا شروع کر دیجئے۔ گھر کے لوگ' اعزّہ' دوست اور سوسائٹی جس میں آپ کا گہرا ربط ہے' ان سب سے ایک عملی کش مکش شروع ہوجانی چاہیے۔ کش مکش اس معنی میں نہیں کہ آپ اپنے متعلقین سے کشتی لڑیں یا ان سے تو تو میں میں اور مناظرہ شروع کردیں۔ بلکہ یہ کش مکش اس معنی میں ہونی چاہیے کہ آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصول و ضوابط کے اتنے پابند ہوجائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر' بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابندِ اصول زندگی کو گوارا نہ کرسکیں۔ آپ کی بیویاں' آپ کی اولادیں' آپ کے والدین' آپ کے رشتہ دار آپ کے رویہ کے خلاف مزاحمت کرنے پر مجبور ہوجائیں۔

آپ اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ جائیں۔ جہاں آپ کسبِ معاش کے لیے رہتے ہوں' وہاں آپ کا وجود نمایاں طور پر کھٹکنے لگے۔ دفتر کی آرام کرسی' جس پر بیٹھ کر جاہ و ترقی کے خواب

دیکھے جاتے ہیں' آپ کے لیے انگاروں کی انگیٹھی بن کر رہ جائے۔ غرض جو جتنا زیادہ قریبی ہو اس سے اتنا ہی پہلے تصادم شروع ہو جانا چاہیے۔ جس شخص کے گھر میں میدانِ جہاد موجود ہو وہ آخر چند میل کے فاصلہ پر ہی کیوں لڑنے جائے۔ پہلا معرکہ تو گھر ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ اب تک جہاں جہاں سے اس کش مکش کی اطلاعات آ رہی ہیں' وہاں کے لوگوں سے مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آ رہی ہیں' وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔

فنا فی الاسلام ہو جانا

مگر میں بروقت یہ واضح کر دوں کہ ہماری یہ کشمکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کش مکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام تر جدّوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے' یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر بربنائے اخلاص ہوتا ہے۔ دشمنی نہیں ہوتی۔ اس کی نفرت' اور اس کا غصہ بالکل مرض کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ مریض کے خلاف' بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لائیے' وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیر سے دیکھا جا رہا ہے یا براہ راست اس کی ذات سے دشمنی کی جا رہی ہے۔ بلکہ وہ آپ کے اندر انسانی ہمدردی' محبت اور اخوت کو کام کرتا ہوا پائے۔ میں نے اجتماعِ دربھنگہ کے موقع پر بھی مختصراً یہ کہا تھا کہ اصلی تبلیغ تقریری اور تحریری مناظروں سے نہیں ہوا کرتی۔ یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنیٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور اور نمونہ ہوں۔ جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے یہ نمونہ گزر جائے وہ آپ کے طرزِ عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کی راہ کے راہی۔ جس طرح کوئی فنا فی الکانگرس' آدمی سامنے آجاتا ہے تو کانگریسیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اسی طرح آپ ایسے فنا فی الاسلام بن جائیے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِذَا رُؤُوْا ذُکِرَ اللّٰہ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا فوراً ہو جانا چاہیے' یہ مقام تو تدریجاً" ہی حاصل ہوگا۔ خدا کی راہ میں جب اپنے ماحول سے پیہم آپ کا تصادم ہوتا رہے گا اور آپ ہر آن' ہر لمحہ اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے ہوئے قربانیاں دیتے رہیں گے' تو ایک مدت میں جا کر فنائیت کی کیفیت آپ پر طاری ہوگی اور آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور بن سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے قرآن و حدیث کو

بامعانِ نظر بار بار مطالعہ کیجئے۔ اور دیکھئے کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرز کے آدمی تیار کیا کرتے تھے۔ وہ کیا صفات تھیں جو اس تحریک کے کارکنوں میں پہلے پیدا کی گئیں، اور اس کے بعد جہاد کا علم بلند کیا گیا۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے مزکّی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انسان تیار کیے تھے انہیں ۱۵ برس کی تیاری کے بعد میدان میں لایا گیا۔ اس تیاری کی تفصیلات معلوم کیجئے اور دیکھئے کہ یہ کس تدریج کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس میں کن صفات کی پرورش مقدّم تھی، اور کن کی مؤخر۔ کون سی صفات کس درجہ میں مطلوب تھیں، اور انہیں کس حد تک ترقی دی گئی تھی اور کس مقام پر پہنچ کر اس ساعت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم دنیا کا بہترین گروہ بن گئے ہو۔ اور اس قابل ہوگئے ہو کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے لیے نکلو۔ یہی نمونہ خود اپنی تیاری کے لیے بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ میں صرف دو حدیثیں آپ کی رہنمائی کے لیے پیش کروں گا۔ جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کام کے لیے کن صفات کے آدمی درکار ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان

یعنی آدمی پورا مومن اس وقت بنتا ہے جب اس کی کیفیت یہ ہوجائے کہ اس کی دوستی اور دشمنی، اور اس کا دینا اور روکنا خالص اللہ کے لیے ہو۔ نفسانی اور دنیوی محرکات اس کے لیے ختم ہوجائیں، دوسری حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

امرنی ربی بتسع میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم دیا ہے:

(۱)	**خشیتہ اللہ فی السر و العلانیتہ**	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں۔
(۲)	**و کلمتہ العدل فی الغضب و الرضا**	کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصہ میں ہوں دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں۔
(۳)	**والقصد فی الفقر و الغنا**	خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت میں، بہرحال راستی و اعتدال پر قائم رہوں۔
(۴)	**وان اصل من قطعنی**	اور یہ کہ جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں۔
(۵)	**واعطی من حرمنی**	اور جو مجھے محروم کرے، میں اسے دوں۔
(۶)	**واعفو عمن ظلمنی**	اور جو مجھ سے زیادتی کرے، میں اسے معاف کروں۔

بقیہ بر صفحہ ۲۷

طبقہ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل

مولانا گوہر رحمن

(۴)

(۶) حجر علی السفیہ (نادان کو مالی تصرفات سے روکنا)

مترفین یعنی نفس پرست سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اصلاح کا ایک طریقہ حجر علی السفیہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کم عقل' بے وقوف اور نادان ہوں اور اپنی جائز املاک میں بھی صحیح اور مفید تصرف نہ کر سکتے ہوں' یا اپنی املاک کو فضول خرچیوں اور معاشرتی جرائم میں اڑاتے ہوں' اپنا مال بھی برباد کرتے ہوں' اور معاشرے میں بد اعمالیاں اور بد اخلاقیاں بھی پھیلاتے ہوں' اور اپنی آخرت بھی خراب کرتے ہوں' تو ان کا اپنی املاک پر حقِ ملکیت اور حقِ انتفاع تو بحال رہے گا' اس لیے کہ املاک حلال ہیں' مگر انہیں حقِ تصرف سے روک دیا جائے گا' اور ان کی املاک ان کے سرپرستوں یا حکومت کے انتظام میں دے دی جائیں گی ایسے لوگوں کو مُبذّرین کہا جاتا ہے۔ یہ جمہور مفسرین کے نزدیک ان سُفَہَا میں شامل ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ:

> اور نہ دو نادانوں کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' اور اس مال میں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو' اور ان سے بھلائی کی بات کرتے رہو' اور آزماتے رہو یتیموں کو' یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ جائیں (بلوغ کے بعد) اگر تم دیکھ لو ان میں ہوشمندی' تو پھر ان کے مال ان کے سپرد کر دو ---(النساء: ۵-۶)

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص سفیہ یعنی نادان ہو تو لین دین میں اس کی جانب سے اس کا ولی یعنی مختار یا سرپرست دستاویز لکھوائے گا۔ سیاقِ کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات یتیموں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن جب ان یتیموں کا ذکر سُفَہَاء کے لفظ میں کیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علّت یتیم ہونا نہیں ہے بلکہ سَفِیہ ہونا ہے'

اور مال حوالے کرنے کی حد بلوغ نہیں ہے بلکہ رشد یعنی ہوشمندی ہے۔
علامہ کاشانی حنفی (م ۵۸۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

امام ابو یوسف ؒ، امام محمد ؒ، امام شافعی ؒ اور عام اہلِ علم نے کہا ہے کہ نادانی اور تبذیر بھی حجر یعنی تصرفات سے روکنے کے اسباب ہیں۔ ان کے نزدیک وہ بے وقوف شخص جو اپنا مال باطل طریقوں پر (غیر شرعی) خرچ کر کے برباد کر رہا ہو، اور وہ شخص جو کاروبار میں دھوکہ کھا جاتا ہو، تو ان سب کو اپنی املاک پر قبضہ رکھنے اور تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۶۹)

امام قرطبی ؒ فرماتے ہیں:

"امام شافعی ؒ فرماتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے مال اور اپنے دین دونوں کو برباد کرتا ہو، یا صرف مال کو برباد کرتا ہو، تو اس کا مال اس کے قبضے میں نہیں دیا جائے گا، اور تصرفات سے بھی روک دیا جائے گا (محجر علیہ) صحابہ میں سے عثمان ؓ، علی ؓ، زبیر ؓ، ابن عباس ؓ، اور عبد اللہ بن جعفر ؓ اور تابعین میں سے قاضی شریح ؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ فقہاءِ اسلام میں سے امام مالک ؒ اور اہلِ مدینہ، امام اوزاعی ؒ اور اہلِ شام، امام ابو یوسف ؒ، امام محمد ؒ، امام احمد ؒ، اسحٰق بن راھویہ (بخاری کے استاد) اور ابو ثور کی رائے بھی یہی ہے" (تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۳۷ - ۳۸)

مُبذِّر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶ - ۲۷)

عبد اللہ بن عباس ؓ، عبد اللہ بن مسعود ؓ اور قتادہ ؒ نے فرمایا ہے کہ: **التبذیر انفاق المال فی غیر حقہ** "مال اس جگہ خرچ کرنا جہاں خرچ کرنا جائز نہ ہو" (احکام القرآن للجصاص) جب مُبذِّر شیطان کا بھائی ہے، تو اگر اس کا مال اس کے قبضے اور تصرف میں ہو گا، وہ اسے شیطانی کاموں پر خرچ کرے گا، اور معاشرے میں شیطانی جرائم کی ترویج کا ذریعہ بنے گا۔ امام ابو حنیفہ ؒ کی رائے یہ ہے کہ بلوغ کے بعد اگر ہوش مندی نہ آئی ہو، تو زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال تک اسے تصرف سے روکا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کا مال لازماً اس کے حوالے کرنا ہو گا، الّا یہ کہ وہ بالکل پاگل یا نیم پاگل ہو۔ مگر جمہور کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص شراب نوشی، جوا بازی، بدکاری، اشاعتِ فواحش، گانے بجانے، قحبہ خانوں اور دوسری عیاشیوں اور

فضول خرچیوں میں اپنی املاک برباد کر رہا ہو تو اس کی جائیداد سرکاری انتظام میں لی جا سکتی ہے مگر اس کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ اس حجر کا مستحق کون ہے اور کون نہیں ہے۔

(۷) خاندانی تکافل (نفقۃ الاقارب)

اسلامی نظامِ معیشت کا ایک اصول یہ ہے کہ ایک خاندان کے لوگ ایک دوسرے کی مالی کفالت کے ذمہ دار قرار دیے گئے ہیں۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو کم ہی ایسے خاندان باقی رہ جائیں گے جو بیرونی امداد کے محتاج ہوں۔ خاندان کے افراد ایک دوسرے کے عاقلہ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی جانب سے دیت بھی ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں' اور دوسری مالی ضروریات پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسلام' خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ قرآن کریم نے رشتہ داروں کی مالی کفالت کو ان کا حق قرار دیا ہے' اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ "اور رشتہ داروں کا حق ادا کرو" (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶)

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى "اور والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرو" (النساء ۴: ۳۶)

ان دو آیتوں کے علاوہ قرآنِ کریم میں آٹھ آیتیں اور بھی ہیں جن میں اقارب کا حق ادا کرنے اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے — عام حالات میں تو رشتہ داروں کے ساتھ مالی تعاون کرنا ایک استحبابی حکم ہے' لیکن اگر وہ محتاج ہوں' معذور ہوں یا اپنی بنیادی ضروریات بھی اپنے وسائل سے پوری نہ کر سکتے ہوں' تو ایسی صورت میں جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال موجود ہو اس پر اپنے اقرباء کی کفالت فرض ہو جاتی ہے' جسے حکومت کے ذریعے جبراً بھی وصول کیا جا سکتا۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۳۳ میں آیا ہے کہ یتیم بچے کو دودھ پلانے والی اور دیکھ بھال کرنے والی عورت کی اجرت اس بچے کے وارث کے ذمے ہے۔ اس آیت پر استدلال کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ

> حنفیہ اور حنابلہ نے اس آیت پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کا خرچہ ایک دوسرے پر واجب ہے۔ یہی بات حضرت عمرؓ اور جمہور سلف سے مروی ہے۔

امام جصاصؒ نے بھی لکھا ہے کہ "والدین اور ذی رحم محرم رشتہ داروں کا خرچہ واجب ہے (احکام القرآن)

یہاں "نَفَقَةُ الْاَقَارِبْ" کی تمام جزئیات اور تفصیلی احکام بیان کرنا پیش نظر نہیں ہے۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں یہ سارے مباحث موجود ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سلسلے میں قانون کا ایک مسودہ بھی تیار کر کے حکومت کو دے دیا ہے جسے بطور قانون ملک میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اردن اور بعض دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس نوع کا قانون نافذ ہے' اس سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۸ اجتماعی تکافل

خاندانی تکافل کے بعد اسلامی معیشت کا اہم ترین اصول اجتماعی تکافل ہے یعنی پورا معاشرہ اور امتِ مسلمہ مجموعی طور پر نادار اور محروم الوسائل لوگوں کی مالی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ حکومت چونکہ معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے اس لیے ایسے اقدامات کرنا اور ایسی تدابیر رو بعمل لانا اس کا فرضِ منصبی ہے جن کی بنا پر معاشرے کا کوئی فرد زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔ اسلامی معیشت میں معاشی ترقی کا مقصد اور اس ترقی کا محرک "تکاثر الاموال" یعنی مال و دولت جمع کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ 'نہیں ہے۔' "تکثیر نفع" کا یہ خود غرضی پر مبنی جذبہ تو بالعموم ارتکازِ دولت اور معاشی عدم توازن کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اخلاقی و دینی تباہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔

اسلامی معیشت میں اصل جذبۂ محرکہ طلب رزق حلال اور باہمی تعاون و تکافل ہے۔ یہ بڑا پاکیزہ اور ہمدردانہ جذبہ ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی تکافل پر مبنی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن و سنت میں کسبِ حلال کی ترغیب دی گئی ہے اور رزقِ حلال کی تلاش کو ایک قسم کی عبادت قرار دیا ہے' لیکن "جمع مال" اور "اکتنازِ مال" کو اللہ اور رسولؐ نے پسند نہیں کیا۔ بلکہ انفاق کا حکم دیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں متقین کی امتیازی صفات میں ایمان اور نماز کے بعد انفاق کا ذکر ہوا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ انفاق کے ساتھ ۵۹ مقامات پر مال خرچ کرنے کا حکم' اور اس کی ضرورت و فضیلت بیان ہوئی ہے۔ زکوٰۃ' صدقہ' اطعام' ایثار' احسان' حق اور جہاد بالمال کے الفاظ میں خرچ کرنے کا ذکر جن مقامات پر ہوا ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ انفاق کے مضمون کی یہ تکرار قرآنِ کریم میں اس لیے ہوئی ہے کہ باہمی تعاون و تکافل کا جذبہ صادقہ بیدار ہو جائے' اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرتے رہیں۔

الف ۔ زکوٰۃ و عشر

اجتماعی تکافل کے لیے اسلام کے اقتصادی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی اور کلیدی حیثیت حاصل

ہے۔ یہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں تیسرا رکن ہے۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کا ذکر ۳۰ مقامات پر ہوا ہے، جن میں سے ۲۸ مقامات پر اس کا ذکر نماز کے ساتھ ایک ہی آیت میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ صدقہ کے ساتھ اس مالی فریضے کا ذکر ۱۲ مقامات پر کیا گیا ہے۔ احادیث کی کتابوں میں سے صرف صحیح بخاری میں زکوٰۃ و عشر اور صدقہ فطر کی فرضیت و فضیلت اور متعلقہ احکام سے متعلق ۱۱۱ احادیث آئی ہیں۔ احادیث کی دوسری کتابوں کی احادیث ان کے علاوہ ہیں۔ دور نبوتؐ اور دورِ خلافت میں زکوٰۃ و عشر اور دوسرے واجبات کی تحصیل و تقسیم کا اجتماعی نظام قائم تھا۔ باقاعدہ عاملین مقرر تھے جو اغنیاء سے فقراء کا یہ حق وصول کر کے تقسیم کرتے تھے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے اخروی عذاب کے بارے میں قرآن کی آیات اور نبیؐ کے ارشادات کا علم تو ایک عام مومن کو بھی حاصل ہے، لیکن اس کی دنیوی تعزیر اور سزا کے بارے میں یہ حدیث ملاحظہ کیجیے!

"بہز اپنے والد حکیم سے، اور وہ اس کے دادا معاویہ بن حَیدہ قُشیریؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، جو شخص طلبِ اجر کے لیے زکوٰۃ دے دے تو اسے اس کا اجر ملے گا۔ اور جو شخص اپنی زکوٰۃ روک دے تو ہم اس سے زکوٰۃ بھی وصول کریں گے، اور اس کے مال کا آدھا حصہ بھی لے لیں گے (جس مال کی زکوٰۃ اس نے روکی تھی)۔ یہ اللہ کے حقوق میں سے ایک حق ہے جس میں سے محمدؐ کے خاندان کو کچھ نہیں ملے گا۔" (سنن ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ، سنن نسائی کتاب الزکوٰۃ، مسند احمد الفتح الربانی ج ۸ ص ۲۱۷ - ۲۱۸، سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۰۵، مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۹۸)

اس حدیث کے متن میں شطر کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی جانب اور جہت بھی آتے ہیں اور کسی چیز کا کوئی ٹکڑا اور حصہ بھی آتے ہیں۔ مگر اس لفظ کے معروف معنی نصف کے ہیں، اور جمہور شارحینِ حدیث نے اس جگہ یہی معنی لیے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص سرکاری کارندوں سے اپنا مال چھپا لے، اور ان کو دھوکہ دے کر زکوٰۃ کی ادائیگی سے پہلو تہی کرے، تو جرمانے اور مالی تعزیر کے طور پر اس کے اس مال کا آدھا حصہ بھی لے لیا جائے گا اور اس مال کی زکوٰۃ بھی وصول کی جائے گی۔ مثلاً ۴۰ بکریوں کی زکوٰۃ ایک بکری ہے اگر کسی نے ان چالیس بکریوں کی زکوٰۃ کارندوں کو دھوکہ دے کر روک لی تو اس سے ۲۱ بکریاں لی جائیں گی، ۲۰ بطور جرمانہ اور ایک بطور زکوٰۃ۔

یا مثلاً ۱۰۰ من گندم کا عشر ۱۰ من ہے۔ اگر کسی نے ۱۰۰ من گندم کا عشر روک لیا، تو اس سے ۶۰ من گندم لی جائے گی، ۵۰ من بطور جرمانہ اور ۱۰ من بطور عشر، اس حدیث کے ایک

راوی بہز بن حکیم کو بعض محدثین نے ثقہ کہا ہے اور بعض نے غیر ثقہ قرار دیا ہے (میزان الاعتدال للذہبی ج ۱ ص ۳۵۳ - ۳۵۴ ' ترجمہ نمبر ۱۳۲۴ ' تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۴۹۸ - ۴۹۹ ' ترجمہ نمبر ۹۲۴) اسی اختلاف کی وجہ سے اس حدیث کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ مگر امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کی سند پر جرح نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ امام احمدؒ نے بھی اسے بغیر کسی جرح کے نقل کیا ہے۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے ' اور ذہبیؒ نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل تو نہیں کیا مگر اس کے راوی بہز بن حکیم سے دوسری روایات نقل فرمائی ہیں' اور ان روایات کو حسن قرار دیا ہے ' قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ "امام احمدؒ اور امام اسحق بن راھویہ (بخاری کے شیخ) نے بہز بن حکیم کی روایات کو قابلِ استدلال کہا ہے۔ بخاری نے صحیح بخاری میں اس کی روایات تعلیقاً نقل کی ہیں اور صحیح بخاری کے علاوہ اپنی دوسری کتابوں میں اس کی روایات سنداً بھی نقل کی ہیں اور ابو داؤد سے مروی ہے کہ یہ ان کے خیال میں قابلِ حجت راوی ہے۔" (نیل الاوطار طبع بیروت ۱۹۷۳ء ' ج ۴ ص ۱۷۹) بہر صورت بہز بن حکیم کی توثیق کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہے' اور ان میں اکابر ائمہ حدیث بھی شامل ہیں اس لیے اس کی یہ حدیث قابلِ استدلال ہے ' اور کم از کم "حدیثِ حَسَن" کا درجہ رکھتی ہے۔

ہمارے فقہا بالعموم تعزیر بالمال یعنی جرمانے کی سزا کو جائز نہیں سمجھتے ' اگرچہ بعض صورتوں میں بعض فقہا نے اس کی اجازت بھی دی ہے۔ مگر عمومی رجحان عدم جواز ہی کی طرف ہے۔ ان کے نزدیک مالی تعزیر رسولؐ اللہ کے زمانے میں دی جاتی تھی مگر اب منسوخ ہو گئی ہے۔ اگر اس زمانے میں مالی تعزیر کی اجازت دے دی جائے تو ظالم حکمران اس کو لوگوں کا مال ناحق چھیننے کا ذریعہ بنا لیں گے۔ لیکن منسوخ کے لیے ناسخ کا ہونا ضروری ہے جو موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ بعض روایات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے کبھی مالی تعزیر دی ہے اور کبھی نہیں دی۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مالی تعزیر دینا واجب نہیں ہے بلکہ عدالت کی صوابدید ہے۔ امام شافعیؒ کا قولِ قدیم یہ تھا کہ زکوۃ نہ دینے والے سے اس کا آدھا مال لے لیا جائے گا ' مگر بعد میں انہوں نے اس سے رجوع فرما لیا اور اس حدیث کو ضعیف قرار دے دیا۔ مگر ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے بعض مخصوص مواقع پر جرمانے کی سزا کو جائز قرار دیا ہے ' اور اس کی متعدد مثالیں نقل فرمائی ہیں جن میں سے ایک مثال زکوۃ نہ دینے والے کے

نصف مال کی ضبطی بھی ہے۔ (الحسبتہ فی السلام از ابن تیمیہ" ص ۳۹ اور اس کے بعد' الطرق الحکمیہ از ابن قیم" ص ۳۲۶ اور اس کے بعد ' اعلام الموقعین از ابن قیم" ج ۲ ص ۹۸ ' اغاثتہ اللھفان از ابن قیم" ج ۱ ص ۳۸۹ طبع بیروت ۱۹۸۷ء)

یہ تعزیر تو اس شخص کے بارے میں آئی ہے جو جنگ کے لیے آمادہ نہ ہو بلکہ دھوکہ دہی کے ذریعے زکوۃ سے بچنا چاہتا ہو ۔ جو لوگ جتھہ بنا کر حکومت کے مقابلے میں جنگ پر تیار ہو جائیں تو ان کے خلاف باقاعدہ جنگ کی جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوۃ کے خلاف جنگ کی تھی اور صحابہؓ نے ان کے فیصلے سے اتفاق کر لیا تھا۔ زکوۃ و عشر ایک مالی عبادت ہے' ٹیکس نہیں ہے۔

اس کا نصاب بھی متعین ہے' جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی ۔ اس کے مصارف بھی سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں متعین کر دیے گئے ہیں۔

ان آٹھ مصارف میں سے ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے' اور اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ عام رفاہی اور قومی ترقی کے کاموں پر زکوۃ صرف نہیں ہو سکتی۔ (دیکھیں ' میرا مضمون ترجمان القرآن جون ۱۹۸۳ء)

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں زکوۃ و عشر کا جو نظام نافذ ہوا ہے وہ پوری طرح نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا ۔ اس لیے کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔

پہلی بڑی خامی تو یہ ہے کہ سودی اکاؤنٹ سے زکوۃ تو کاٹی جاتی ہے' لیکن زکوۃ سے تین گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ سود کی رقم اسی اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دولت کی تقسیم کی بجائے مزید ارتکاز ہو جاتا ہے ۔ شرعی طریقہ یہ ہے کہ سود کا معیشت سے مکمل خاتمہ کر دیا جائے ۔ اور سود کی جو رقم لوگوں کے حسابات میں جمع ہو گئی ہے یا سود خوروں نے نکال لی ہے' پورا پورا حساب کر کے وہ سب ضبط کر لی جائے ۔ اس لیے کہ ناجائز دولت جس شکل میں بھی ہو اس کا ضبط کرنا اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے' اور سود کی حرمت کا قانون اسی وقت سے مسلمانوں پر ساری دنیا میں نافذ ہو چکا ہے جس وقت یہ حکم نازل ہوا تھا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا "چھوڑ دو جو بھی بقایا ہے تمہارا سود میں سے" البتہ اس حکم کے نزول سے قبل لوگوں نے سود کی جو رقم وصول کر لی تھی اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ سودی رقم کی ضبطی کے بعد بنکوں کے ہر قسم کے اکاؤنٹس سے زکوۃ کاٹی جائے ۔

(جاری ہے)

سورۂ کوثر اپنے اسلوب کے آئینے میں

ڈاکٹر مجید بیدار

دنیا کی تاریخ میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس نے اپنے ہر لفظ اور جملے پر انسان کو متوجہ کیا ہو، اور کوئی ایسی کتاب بھی نہیں جو اوّل سے آخر تک بغیر کسی ترتیب کے اختلاف کے یاد کر لی جائے۔ یہ اعزاز قرآن مجید ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ہر لفظ اور جملے یا آیت میں قوت تاثیر کے ساتھ ازبر ہو جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ قرآن کا یہی اعجاز اسے ایک آسمانی کتاب ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ بآسانی حفظ کر لی جاتی ہے، اور اوراق میں قید رہنے سے زیادہ دلوں میں جگہ بناتی ہے۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہونے کے علاوہ اپنے اندر تاثیر کے کئی زاویے رکھتی ہے۔ اس کی آیتوں اور الفاظ میں نہ صرف متوازن ترتیب اور مناسب ہیئتِ ترکیبی موجود ہے، بلکہ الفاظ اور آوازوں میں ایسا ترنم موجزن ہے جو معنی و مفاہیم سمجھے بغیر بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں مسلمانوں کی اکثریتی آبادی "قرآن ناظرہ" پڑھنے والوں کی ہے جو آیتوں کے معنی و مفہوم کی بازیافت کے بغیر بھی قرات پر سر دھنتے ہیں، اور تاریخ میں ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ عربی زبان سے واقفیت نہ رکھنے والا بھی قرات پر ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ اور ولید بن مغیرہؓ نے قرآن مجید کے الفاظ و معانی کی سحر کاری سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ عرب کافر تلاوتِ قرآن سننے سے اجتناب برتتے تھے کیونکہ ان کا تاثر تھا کہ قرآن کی جادو بیانی سے متاثر ہو کر لوگ اپنے آبائی مذہب سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ غرض لسانیات کا ہر ماہر یہ بات قبول کرتا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ و آیات میں ایک خاص جاذبیت ہے جو انسانوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

قرآن کے نزول سے دورِ حاضر تک، اس چودہ سوسال سے زائد عرصہ تک دنیا کے ماہرینِ

لسانیات قرآنِ مجید کی لفظی جاذبیت اور آیتوں کی کرشمہ سازی کے قائل رہے لیکن ادب و انشاء اور فصاحت و بلاغت کے کسی ماہر کو قرآن کے الفاظ اور ان کی آوازوں میں موجود کیفیت یعنی آہنگ اور صوتیات کے وصف سے آگاہی نہ ہو سکی۔ دنیا میں پھیلتے ہوئے علوم و فنون نے "قرآن فہمی" کو حد درجہ آسان کر دیا ہے اور آج کی اسلوبیاتی تنقید کے نتیجے میں یہ شناخت ممکن ہو گئی ہے کہ الفاظ سے پیدا ہونے والی آوازوں کے تسلسل، تواتر اور توازن سے لفظوں کی غنائیت کو پرکھا جا سکے۔ چنانچہ یکساں آوازوں کے تواتر سے الفاظ میں نغمگی پیدا ہوتی ہے اور یہی نغمگی متاثر کرنے کا سبب قرار پاتی ہے۔

مترنم آوازوں کا ایک دوسرے سے متوازن انداز میں اختلاط جاذبیت کا سبب بنتا ہے، اور الفاظ میں متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کی جملہ ۱۱۴ سورتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اسلوب میں متوازن اور مترنم الفاظ کچھ اس انداز میں ہیں کہ ان الفاظ میں معنویت کی ایک کائنات کے ساتھ نغمگی کے بے شمار جزیرے آباد ہیں۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کا اسلوبیاتی جائزہ ایک مضمون میں لینا ممکن نہیں اس لیے قرآن کی ایک مختصر سورہ "سورۂ الکوثر" کے تجزیے کے ذریعے یہاں ان رموز اور اسرار پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جن کی وجہ سے اس سورہ میں قوتِ تاثیر کے ساتھ ساتھ دل موہ لینے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اسلوبیاتی اعتبار سے جس کلام میں صفیری (Spirant) آوازیں، یعنی با۔ تا۔ ثا۔ سا،شا کا اور یا، پہلوئی (Lateral) آوازیں، یعنی لا(ل)، اور انفی (Nasal) آوازیں، مثلاً ما اور نا، کے علاوہ غنائی آوازوں کا متوازن دخل ہوتا ہے وہ اسلوب کی خصوصیات کے ساتھ سحرکاری کی تاثیر رکھتا ہے۔ قرآن مجید کی تمام تر آیتوں میں ان مترنم اصوات کی موزوں تکرار اور مناسب نشست سے خاص ماحول پیدا ہو گیا ہے۔

ذیل میں سورۂ کوثر کی اسلوبیاتی تشریحات کے ذریعے یہ بات واضح کی جائے گی کہ اس سورہ کی آیتوں میں مستعمل الفاظ نغمگی کی موزونیت اور تاثیر کے تمام تر لطف سے مالا مال ہیں۔ اسی وصف کی وجہ سے قرآنِ مجید کی دوسری سورتوں کی طرح سورۂ کوثر بھی دلوں کو مسحور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○	ن ن ط ی / ن ک ل ک / و ث ر
فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○	ص ل ل ل / و ب ب ک / ن ح ر
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ○	ن ن ش ن / ی ک ل ب / ت ر

پہلی آیت میں ن اور ک کی تکرار سے مخصوص نغمگی پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں ل کی تکرار موجود ہے' اور تیسری آیت پھر ن کی تکرار کے لطف سے مربوط ہو گئی ہے۔ اس طرح تین آیتوں پر مشتمل اس سورہ میں آوازوں کی ترتیب کا اس طرح جائزہ لیا جائے گا۔

جملہ آوازیں: ۴۸

حرفم آوازیں: ۳۲

ہسکاری آوازیں: ۱

ن کی تکرار: ۷

ل کی تکرار: ٦

ر کی تکرار: ۴

کلام میں ہسکاری (Aspiratal) آوازوں کی کثرت جاذبیت کو بوجھل کر دیتی ہے۔ اس سورہ میں صرف ایک ہسکاری آواز استعمال ہوئی ہے' جس سے لطف کلام میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سورۂ کوثر کی اس لفظی جاذبیت میں درحقیقت آوازوں کے اتار چڑھاؤ کو دخل ہے۔ جب آوازیں ایک ہی رو میں بہتی ہیں تو ان کی کیفیت پیدا کرنے کے عمل میں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آوازوں کے توازن اور تواتر کے باوجود تاثر کا ماحول پیدا نہیں ہوتا' جس کی وجہ سے لہجہ میں سپاٹ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے کلام کو ادبی' علمی اور تشریحی طور پر تو مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے' لیکن صوتی و فنی طور پر کوئی حیثیت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ سورۂ کوثر کی پہلی آیت پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلی دو آوازیں بڑی مدھر اور یکساں ہیں چنانچہ "نانا" کے توازن پر "طا" کی جب تان ٹوٹتی ہے تو سمندر کی خاموشی میں تلاطم پیدا ہو جانے کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ پھر "نا" اور "کا" کی آوازوں سے متوازن اور ہم وزن اصوات کا حق ادا ہوتا ہے۔ لیکن پھر "لا" کی آواز کے ذریعے تواتر کو توڑ دیا جاتا ہے' جس سے پانی کی لہروں کے اتار چڑھاؤ کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اسی طرح "وا" کے بعد "ثا" کی بلندی کے ساتھ ہی "را" پر پھر آواز پستی میں چلی آتی ہے۔ اس تواتر کے ساتھ آوازوں کا اتار چڑھاؤ یہ ثابت کرتا ہے کہ سورۂ کوثر میں جاذبیت بہتے پانی کی تاثیر رکھتی ہے اور دلیل پیش کرتی ہے کہ جس طرح آیتوں کی آوازوں کا موجزن رہنا اسے زندگی بخشتا ہے اسی طرح انسان کو بھی متحرک رہنا چاہیے۔ ان آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے مخصوص کیفیت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک کا درس بھی ملتا ہے۔

پہلی آیت میں آوازیں موجزن نظر آتی ہیں' لیکن دوسری آیت میں آوازوں کا تلاطم نظر نہیں آتا' بلکہ ایک ایسا انداز سامنے آتا ہے جیسے کوئی سمجھانے والے انداز میں سرگوشی کر رہا ہے۔ آوازوں کے ذریعے لہجہ کے دھیمے پن کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ "صا" کے بعد "لا لا" کے ذریعے تمام قوتوں کے منبع نے کس عمدہ انداز میں لا کی تکرار کی قوت کو مخصوص کیفیت کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے "لا لا" نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ کوئی سرگوشی کر رہا ہے۔ یہ عمل نغمگی کا ایک ایسا سوتا ہے جو تخاطب کے ہزار انداز پر قربان کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر انسان بھرپور ارادہ کر کے بھی ایسا کلام لکھنا چاہے تو بھی یہ انداز پیدا نہیں ہو سکتا۔ آوازوں کا یہ دھیما پن اور سرگوشی جیسا عمل خود ثابت کر دیتا ہے کہ یہ انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے رب العزت نے سورۂ کوثر میں دوسری قرآنی سورتوں کی طرح یکساں آوازوں کو جگہ نہیں دی کیونکہ خدا جانتا ہے کہ انسان یکسانیت سے اوب جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں آوازوں کے استعمال کا ایک مختلف انداز ہے جب کہ صرف تین الفاظ اس آیت کی زینت بنے ہیں۔ دوسری آیت میں آواز کی ایک مختلف شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگر پہلی آیت والی آوازوں کو نشیب و فراز رکھنے والی اصوات کا درجہ دیا جائے' تو دوسری آیت والی آوازوں کو بجا طور پر سرگوشی والی اصوات کا نام دیا جا سکتا ہے۔

پہلی اور دوسری آیتوں میں مستعمل آوازوں سے جو کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور سحر کار نغمگی پھوٹ رہی ہے' اس حقیقت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو ان آیتوں کے ذریعے نغمگی میں ڈوب جانے کا سبق نہیں دیا' بلکہ پہلی آیت میں جو نغمگی برقرار رکھی گئی ہے اس سے مختلف نغمگی کو دوسری آیت میں جگہ دے کر خدا نے نغمگی کے فسوں کو توڑ دیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خدائے تعالیٰ انسان کو قرآن کی آیتوں کی آوازوں میں مدہوش رہنے کا سبق نہیں دیتا' بلکہ متحرک اور فعال رہنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں پہلی آیت جیسی آوازوں کو استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ ہم وزن آوازوں کے تواتر سے یکسانیت اور ڈوب جانے کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے' اور انسان غنودگی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ موسیقی کا یہی فسوں ہوتا ہے جس میں ڈوب کر انسان جھومنے لگتا ہے۔ قرآن کی آیتوں کے الفاظ میں آوازوں کی غیر یکسانیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اپنے سامع یا قاری کو لفظ و صوت میں منہمک کر دینا نہیں چاہتا بلکہ عمل کی دعوت دیتا ہے۔

سورۂ کوثر کی دوسری آیت کی پہلی چار اصوات کی طرح' دوسری آوازوں میں بھی سرگوشی کی خصوصیت نمایاں ہے چنانچہ آنکھیں موند کر ذرا ان آوازوں کے تاثر کو ملاحظہ فرمایئے "را" "بابا" "کا" ' "نا" "حا" "را" ۔ ایسا لگتا ہے جیسے توازن کے ساتھ مکالمہ کیا جا رہا ہے۔ "را'بابا' کا" کے ذریعے کوئی پوچھ رہا ہے' اور جواب "نا' حا' را" کے ذریعے دیا جا رہا ہے۔ جب ان آوازوں کے سمجھانے والے رویے اور مکالماتی عنصر کے ساتھ سوال و جواب کی کیفیت پر غور کیا جاتا ہے' تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ بیان کی معنویت تو ایک اہم بات ہے لیکن صرف آوازوں کے ذریعے تاثر پیدا کرنے کا عمل تو انسان کے حیطۂ قوت میں نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس سورہ میں آوازیں نہیں ہیں بلکہ بڑی حکمت کے ساتھ آوازوں کو تاثر اور معنویت سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے ایک ایک لفظ کی آوازوں میں بالکلیہ جدا گانہ تاثر دکھائی دیتا ہے چنانچہ لِرَبِّکَ کے الفاظ کی آوازوں میں کلام کرنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' تو وَانْحَرْ کے لفظ کی آوازوں میں جواب دینے کی تاخیر پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اگر تھوڑی دیر کے لیے گردن کو سیدھے جانب موڑ کر "را" "با" "کا" کا ورد کیا جائے اور فوری گردن کو بائیں جانب موڑ کر "نا" "حا" "را" دہرایا جائے' تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تاثر کی ایک کائنات ان آوازوں میں پوشیدہ ہے اور ان اصوات سے ذکر کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور لا الہ کے ذکر کے بعد الا اللہ کی جو ضرب دل پر لگائی جاتی ہے وہی انداز وَانْحَرْ کے اصوات سے پیدا ہو جاتا ہے۔

سورۂ کوثر کی تیسری اور آخری آیت کے الفاظ کی آوازوں پر سطوت کا گمان ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اثبات میں کہہ رہا ہو "ناتا شاتا"۔ یہاں پر آوازوں کے ساتھ خاص تاثر بھی پیدا کیا گیا ہے چنانچہ اقراریہ جملہ کی طرح "ہاں ہاں" کے لیے گردن کو اوپر سے نیچے ہلانے کے عمل کے ذریعے ان آوازوں کو ادا کیا جائے تو جس بے ساختگی کا اظہار ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جس کے ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے کہ آوازوں کی یہ حسنِ ترتیب اور ان میں موجود کیفیت انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ انسان جس قدر بھی منصوبے اور ارادے کے تحت کام کرے گا' وہ کیفیتیں تو پیدا کر لے گا اور خیال کی ترتیب اور ترسیل کا حق بھی ادا کر دے گا' لیکن اصوات کے ربط و ترنم اور ان کی تہذیب میں کہیں نہ کہیں اس سے چوک کا احتمال ممکن ہے۔ کیونکہ سورۂ کوثر میں آوازوں کی تہذیب اور اصوات سے کیفیت کی عکس کشی کے ساتھ ساتھ آوازوں سے اظہار کا ربط پیدا کیا گیا ہے' جو انسان کے احساس اور ارادہ سے بالاتر ہے' اسی لیے یہ کلام سوائے خدا کے کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

آوازوں کی تہذیب کا عمل، اصوات کے دھیمے پن اور موقع اور محلِ استعمال کے اعتبار سے ان میں سبک اور رواں انداز اختیار کرنے سے تکمیل پاتا ہے۔ اگر کلام میں آوازوں کے یہ اجزاء تکمیل پا جائیں تو اس کے فصیح و بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ لسانی اور ماورائی ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ (سورۂ کوثر کے اسلوب کے چند نکات پر روشنی ڈالنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس کی آیتوں میں آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور تہذیب اصوات کے ساتھ آوازوں سے تاثر پیدا کرنے کا عمل سوائے ماورائی طاقت کے کوئی اور ہستی انجام نہیں دے سکتی۔)

فصاحت اور بلاغت کا حسن بھی اسلوبیاتی عمل کا پروردہ ہے، اور آوازوں کے مخصوص انداز سے استعمال کی وجہ سے ہی کلام میں دل بستگی اور دل فریبی پیدا ہوتی ہے۔ عموماً" تکرر، تشخص، صنائع معنوی، صنائع لفظی، محاکاتی عوامل اور لفظیات کی تمام تر کائنات آوازوں کے حسین امتزاج سے معنون ہے، اور وہی کلام قوت تاثیر سے مالا مال ہوتا ہے جو آوازوں کے تمام حسین امتزاجوں سے مربوط ہو۔ اس پس منظر میں جب سورۂ کوثر کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورہ آوازوں کا ایک ایسا حسین سنگم ہے جو آوازوں کو مکالماتی سرگوشی اور سبک روی سے مربوط کر کے معنی و مفاہیم کے ہزار ہا دفتر کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

اس مضمون میں سورۂ کوثر کی معنویت بیان کرنے سے اجتناب اس لیے ضروری ہے کہ موضوع کا تعلق صرف اسلوب سے وابستہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا سورہ صرف لفظی بندشوں اور آوازوں کی ہمہ گیر صلاحیتوں سے مالا مال ہی نہیں بلکہ مفہوم کی بے پایاں گہرائیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

گو کہ اس سورہ میں سحرکاری اور فسوں سازی موجود ہے لیکن یہ جادو گری عام کلام کی طرح نہیں جو انسان کو اپنے مقصد حقیقی سے غافل کر دیتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی تمام زبانوں کا ہر کلام جو اسلوبیاتی تاثیر رکھتا ہے، اپنی آوازوں کے جادو میں انسان کو مقید کر لیتا ہے اور اس پر مدہوشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ سورۂ کوثر کی آیتوں کے الفاظ میں موجود آوازیں انسان پر مدہوشی طاری نہیں کرتیں بلکہ ان آوازوں کی نغمگی انسان کو عالم شعور میں لا کر اس کے شعور اور تحت الشعور کو روشن کرنے کا سبب بنتی ہے۔

سورۂ کوثر اور خاص طور پر قرآن مجید کے ترجمے دنیا کی تقریباً" ہر زبان میں ہوئے، اور بعض شعراء نے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دینے کے لیے منظوم ترجمے بھی پیش کیے اور اپنے فن اور صلاحیتوں کے تمام ذرائع استعمال کر لیے، لیکن سورۂ کوثر کے عربی متن اور اس کے مزاج کی خوبی

کی ہمسری نہیں کی جا سکتی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعر یا نثّار سورۂ کوثر کی معنویت، لفظیت اور اس کے اظہار کی گہرائی سب کو تو اپنی زبان میں سمیٹ لے سکتے ہیں لیکن سورۂ کوثر کے الفاظ کی آوازوں میں جو ترتیب و تہذیب روا رکھی گئی ہے اس کے ترنم اور نغمگی کے ساتھ خیال کی ترسیل انسان کے بس کا روگ نہیں۔ آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے اس جائزے کے بعد سورۂ کوثر میں موجود اصوات کے تمام تر تلفظ کو سامنے رکھتے ہوئے سورۂ کوثر جیسا پیرایہ استعمال کرنا چاہے تو کسی بھی انسان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ایک کلام تو خالق کا ہے اور دوسرا مخلوق کا۔ اس لیے دونوں میں ہم آہنگی، یکسانیت اور تواتر و توازن قائم ہونا ایک ناممکن امر ہے، جس کا دعویٰ خود قرآنِ مجید نے کیا ہے۔

لفظیات کا جو کیف سورۂ کوثر کے الفاظ کی آوازوں میں موجود ہے اس کے اظہار اور بیان کی گرمی کو الفاظ کے ذریعے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ حاضر میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ لفظوں کی تراش خراش اور نئی تراکیب کے ذریعے الفاظ وضع کرنے کے ساتھ ساتھ لفظوں کی آوازوں سے ان کے اندر کی چھپی ہوئی غنائی کائنات کا پتہ چلانا ایک جدید ترین عمل ہے اور سائنسی ترقیات کی دین سے اس عمل کی پیدائش ہوئی ہے۔ لیکن قدیم دور ہی سے قرات کے مختلف طریقے اور قرآن کی آیتوں کی ادائیگی، مخارج اور تجوید کے ذریعے علمائے اسلام نے اسلوب میں پوشیدہ آوازوں کی ترکیب اور اس کی شناخت کر لی تھی۔ الفاظ میں موجود آوازوں کی حقیقت اور ان کی اثر پذیری کا واضح تصور عالمی زبانوں میں سوائے عربی کے کسی اور زبان میں پایا نہیں جاتا۔ انگریزی زبان کے ماہرینِ لسانیات نے اس زبان کی Phonetics تیار کر لی ہے، پھر بھی عربی الفاظ میں موجود آوازوں کی بالادستی قائم ہے۔ سورۂ کوثر کے الفاظ میں موجود آوازوں کی حقیقت اور ان کی پہچان سے نہ صرف قرآنی آیتوں میں موجود سحر کاری اور ان کے پیچھے آباد اصوات کے کئی جزیروں کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان آیتوں میں متاثر کرنے کی قوت کے پیدا ہونے کی وجوہات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ غرض ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآنی آیتوں کے اعجاز کو پوری معقولیت پسندی کے ساتھ قبول کیا جائے اور ہر آیت کے الفاظ کی آوازوں میں موجود اسرار و رموز کی شناخت کی جائے۔ جدید ترقیات کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید کی آیتوں کے اسرار و رموز سے بھی یکے بعد دیگرے پردے ہٹتے جائیں گے، اور بقول قرآن جو دیدۂ بینا رکھتے ہیں، وہ ان سے فیض یاب ہوتے جائیں گے۔ سورۂ کوثر کے اسلوبیاتی جائزے سے اس سورہ کی لفظیات، لفظی کیفیات اور اصوات سے کما حقہٗ واقفیت ہو جاتی ہے اور قرآنی آیتوں کی نئے اسلوبیات کے ساتھ لسانی پس منظر میں تحقیق کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

آبادی میں ردّوبدل ---- نو آبادیاتی پالیسی

مرزا محمد الیاس

(۱)

۱۸۵۰ء میں الجزائر میں فرانسیسی اور یورپی آبادی کے بارے میں اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ فرانسیسی یلغار سے پہلے بہت کم یورپی' الجزائر میں موجود تھے۔ ۱۸۳۰ء میں ۳۷ ہزار فوجیوں کے ہمراہ فرانسیسی جنرل جب الجزیرہ میں داخل ہوئے تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ دن اسلام اور یورپ کے حوالے سے ایک اہم دن بن جائے گا اور آنے والے سالوں میں شمالی افریقہ سے اسلام کو بے دخل کرنے کی یورپی کوششوں کا محور و مرکز ٹھہرے گا۔ الجزائر کے معاشرتی نظم کو توڑنے کے لیے جو مختلف راستے اختیار کیے گئے ان میں اس بات کو بھی مرکزی اہمیت حاصل تھی کہ اس ملک میں اہم اور حساس علاقوں میں باقاعدہ یورپی بستیاں بنائی جائیں اور نو آبادکاروں کو فرانس اور یورپ سے لاکر اس انداز سے بسایا جائے کہ پورے الجزائر کو فرانس کا ایک صوبہ بنایا جا سکے۔ ۱۸۵۰ء میں فرانس اور یورپ سے آئے ہوئے ان باشندوں کی کل تعداد ۱۲۵٬۹۶۳ تھی۔ الجزیرہ میں ۵۴٬۷۸۴' اوران (Oran) میں یہ تعداد ۴۴٬۵۰۷ اور صوبہ (Constantina) میں یورپی فرانسیسی باشندوں کی تعداد ۲۶٬۶۷۲ تھی۔

> "دسمبر ۱۸۴۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق کل یورپی باشندے ۱۱۳٬۶۰۷ تھے۔ الجزیرہ میں ۵۷٬۸۱۰ باشندے تھے جن میں اکثر فرانسیسی تھے' اوران میں ۳۵٬۲۴۶ اور Constantina میں ان کی کل تعداد ۱۹٬۹۵۱ شمار کی گئی تھی۔ الجزیرہ میں فرانسیسی ۳۰٬۸۹۷ دیگر یورپی ۲۶٬۹۱۳ اوران میں فرانسیسی ۱۵٬۹۵۹ اور دیگر یورپی اقوام کے ۱۹٬۲۸۷ افراد موجود تھے جبکہ تیسرے صوبے Constantina میں فرانسیسی باشندے ۱۱٬۱۳۰ جبکہ یورپی باشندے ۸٬۳۰۲ تھے۔ (۱)"

سوئٹزر لینڈ' فرانس اور جرمنی سے یورپی باشندے الجزائر کا رخ اس لیے کرتے تھے کہ یہاں

(1) Tableau de la Situation - Bisfeld 1850 Page - 88 - 109

انہیں زیادہ نفع بخش ملازمتیں مل سکتی ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر کسانوں اور دستکاروں کی اکثریت تھی۔ یورپی مورخین کا کہنا ہے کہ جب یہ یورپ کے مختلف علاقوں سے نکل کر الجزائر پہنچتے تو انہیں سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعض بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے اور بعض غیر اخلاقی کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ تلاشِ معاش کے لیے اپنے آبائی ملکوں کو چھوڑ کر شمالی افریقہ کا رخ کرنے والے ان یورپی باشندوں کے مسائل کو یہاں پہلے سے موجود نو آباد کاروں کے رویے سے زیادہ شدت ملتی۔ فرانس، اٹلی، یونان اور سپین کے ساحلوں کی یہ تلچھٹ ہر نئے سورج کے ساتھ الجزائر میں داخل ہوتی۔ صاف ظاہر تھا کہ جو لوگ اپنے گھروں کو فراموش کر کے آرہے تھے وہ یہاں پہنچ کر نئے حالات میں بہتری اور خوشحالی کے متمنی تھے لیکن فرانسیسی افواج کے نئے طرزِ عمل نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ فرانسیسی افواج مسلمانوں کے قبائل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی مہمات میں پوری قوت کے ساتھ مصروف تھیں۔ جس طرف بھی ان کا رخ ہوتا گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے جاتے، پندرہ سال سے زیادہ عمر کے مردوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا۔ ۱۸۴۰ء میں ایک فرانسیسی کرنل نے اندرونی علاقوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی افواج کو حکم دیا کہ

"عربوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے اس پالیسی کو اختیار کیا جائے کہ پندرہ سال سے زیادہ عمر کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، تمام عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا جائے اور انہیں بحری جہازوں کے ذریعے کسی دور دراز جزیرے پر جلا وطن کر دیا جائے دوسرے الفاظ میں ان تمام انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے جو ہمارے قدموں میں کتوں کی طرح گرنے کے لیے تیار نہ ہوں"۔

فرانس کے فوجی کمانڈروں کو جنگ کے دوران ہائی کمان سے اسی نوعیت کی ہدایات ملتی رہتی تھیں۔ مغرب کے دانش مندوں کا کہنا ہے کہ الجزائر کو فرانس کی کالونی بننے کا بہت فائدہ ہوا سڑکیں بنیں اور عمارتیں کھڑی کر دی گئیں، لیکن شاید وہ اس حقیقت کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے کہ ان سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر میں اینٹوں کی جگہ انسانی جسم اور گارے کی جگہ مسلمانوں کا خون استعمال کیا گیا تھا۔ یہ پندرہ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کی کچلے ہوئے بدن تھے جن پر فرانس نے اپنی کالونی تعمیر کی تھی۔

فرانس اور یورپ سے آنے والے آباد کار ان خالی مکانوں اور عمارتوں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا تھا جن دیواروں پر لہو کے چھینٹے ابھی اپنی خوشبو دے رہے ہوں ان کے سائے میں بیٹھ کر یورپی اقوام نے بہت غلط اندازے لگائے تھے۔ انسانی جسم کی پہچان

پر بیٹھ کر انسان سے ہی مدد لینا کیسا عمل ہو سکتا ہے اس کا اندازہ تو شکار ہونے والا انسان ہی بتا سکتا ہے۔ بہر کیف تو واردانِ یورپ کے لیے یہ تجربہ اس لیے ضرور تلخ ہو گا کہ جن ملازمتوں کے خواب انھوں نے دیکھے تھے وہ تو کہیں نہیں تھیں۔ اس پریشانی کا حل انھوں نے نکال لیا۔ اور آہستہ آہستہ معیشت، معاشرت اور سیاست کے ہر کل پرزے کا نام الجزائر کے آبائی باشندوں کی بجائے اہالیانِ یورپ کے نام سے موسوم ہوگیا۔ ان کے اقدامات سے الجزائر کے مقامی باشندوں کو جو فائدہ پہنچا تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں بنتی ہے۔

(ا) یورپ کے کسانوں کی آمد نے الجزائر کے کسانوں کو بھوک و افلاس کا شکار کر دیا۔ زمینوں پر فرانسیسی قبضوں کے سلسلہ نے طول پکڑا اور انجام کار وہ الجزائر کی زمینوں پر اس قدر قابض ہو گئے کہ مقامی کسان کو اس کی فصل کا ایک ایسا حصہ ملتا جو تباہ حال ہوتا۔ دو تہائی حصہ فرانسیسی کمپنیاں لے جاتیں اور بچا کھچا وہ جاگیردار ہتھیا لیتے جو فرانسیسی استعمار کے خوشامدیوں کی صورت میں مراعات حاصل کرتے تھے۔

(ب) تعلیم پر مکمل گرفت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مقامی لوگوں کی ۸۲ فیصد آبادی کو ان پڑھ رکھا گیا۔ اس حقیقت کا اعتراف ۱۹۵۴ء میں خود فرانس کی حکومت نے اپنے جاری کردہ اعداد و شمار کے ذریعے کیا۔ جبکہ انہی اعداد و شمار کے مطابق ہر فرانسیسی اور ہر یورپی تعلیم یافتہ تھا۔

(ج) الجزائری باشندوں کے روزگار کے مسائل میں شدید اضافہ ہوا۔ کاروبار تباہ ہو گئے اور حالات اس قدر بگڑے کہ اگر یورپی باشندہ سات ڈالر کماتا تو الجزائری مسلمان ایک ڈالر بھی بمشکل کما پاتا۔

(د) اس شدید معاشی دباؤ اور سماجی و دینی جبر کے ظلم (۱۹۵۴ء) میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو کل آبادی ایک کروڑ تھی اس میں سے دس لاکھ شہری مستقل بے روزگار تھے جبکہ بیس لاکھ شہری ایسے تھے جن کی ملازمت جزوی تھی اور انھیں ہر نئے دن، تلاش معاش کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔

(ر) بچوں میں شرح اموات دنیا بھر سے زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ الجزائر میں ایک ہزار میں ۲۸۴ بچے پیدائش کے فوراً بعد مرجاتے تھے۔ یہ شرح اس وقت دنیا میں شرح اموات کے اعتبار سے چار گنا زیادہ تھی۔ یہ جاننا مشکل نہیں ہے کہ اس کی وجہ وہ غیر صحت مند ماحول تھا جس میں یہ لوگ رہ رہے تھے۔ تنگ دامنی اور

بے روزگاری نے مسائل کو مزید الجھا دیا تھا' ہر گھر میں بیروزگار تھے اور ہر گھر میں بیمار۔

(س) یورپی آباد کاروں نے زمین ہتھیانے کی پالیسی اختیار کی تو اس کی وجہ سے ایک خوشحال الجزائر تباہ حال ملک میں بدل گیا۔ ۱۸۷۱ء میں اناج کی فی کس سالانہ پیداوار ۵۶۰ پاؤنڈ فی کس تھی' ۱۹۴۰ء میں ۲۸۰ اور ۱۹۴۸ء میں ۲۲۴ پاؤنڈ رہ گئی۔

یہ الجزائر کی سماجی و معاشی حالت کا انتہائی اجمالی جائزہ ہے۔ یورپ کا مورخ جب بھی لکھتا ہے تو یہی کہ یورپیوں کو شدائد کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں نقل و حرکت کی آزادی میسر نہ تھی' وہ ملازمتیں اختیار نہیں کر سکتے تھے' ان پر ظلم کیا جاتا تھا' ان کے مسائل کو جاننے اور حل کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر واقعی الجزائر میں آکر وہ اس قدر تنگ دست اور تہی دامن ہو گئے تھے تو انہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ایک ملک کی آزادی سلب کیوں کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے مظالم کی تفصیلات کو چھپانے کے لیے یہ سارے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔

پیرس پولیس کے ریکارڈ کے مطابق ۱۸۳۰ء کے فوراً بعد الجزائر میں غیر ملکی باشندوں کے لیے مشکلات اور مسائل محض واقعاتی تھے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق بیس ہزار میں سے صرف پندرہ یورپی باشندوں کو مقامی آبادی کی طرف سے مشکلات کی شکایات سننے میں آئیں۔ ان یورپی باشندوں کی اکثریت ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو آوارہ گرد اور بے روزگار ہوتے۔ ایسے نوجوانوں کی فطرت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الجزائر کے مسلمانوں نے اگر کبھی ان سے تعرض کیا ہوگا تو اس کی وجہ ان نوجوانوں کی غیر اخلاقی حرکات تھیں۔ Baron Bade کے مطابق پولیس نے اس قسم کے نوجوانوں کو جمع کیا' ان کی تعداد ۴۵۰۰ تک جا پہنچی انہیں عربوں کے خلاف فرانس کے لیے خدمات سرانجام دینے کے لیے کام سونپا گیا جسے انہوں نے خوش اسلوبی سے پورا کر دکھایا۔ جے آر موریل کا کہنا ہے کہ فرانسیسی اور یورپی باشندے زراعت کے شعبہ میں مقامی آبادی سے بہتر تھے' وہ لکھتا ہے:

"فرانسیسی الجزائر میں ناقابلِ برداشت نو آباد کار تھے۔ اس کالونی میں سب سے بہترین زراعت پیشہ یہی لوگ تھے۔ ۱۸۳۰ء کے حملے کے بعد ایک خاص مدت تک الجزائر آنے والے 'فرانس کے شہریوں کی اکثریت' شراب کشید کرنے کا کاروبار کرتی تھی یا پھر آوارہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کا دھندا کرتی۔ مختصر یہ کہ فرانسیسی اپنی فوج کے مفتوحات سے فائدہ اٹھانے والوں میں سے تھے۔" (۲)

ان آباد کاروں کے الجزائر کے سماج اور معاش پر قبضہ کرنے کا سلسلہ تو ۱۸۳۰ء کے ساتھ ہی

(۲) Algeria J.R.Morell Page 349

شروع ہو گیا تھا۔ آبادی میں شرح کی تبدیلی کا آغاز ۱۸۴۰ء سے ہوا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر کل یورپی باشندے ایک ہزار تصور کر لیے جائیں تو اس میں مختلف یورپی اقوام کی شرح یوں بنتی ہے:

فرانسیسی	۴۱۵	سپینی	۳۲۰
مالٹا	۱۲۶	اٹلی	۱۰۳
جرمن	۳۶		

ڈاسن بورر کے مطابق ۱۸۴۰ء میں یورپی آبادکاروں کی کل تعداد ۲۵ ہزار تھی جبکہ یکم جنوری ۱۸۴۵ء کو یہ تعداد بڑھ کر ۸۶،۷۷۵ ہو گئی اس طرح پانچ سالوں میں ۲۵ ہزار سے زیادہ یورپی آباد کار الجزائر آئے اور چھ سال کے عرصے میں ان کی آبادی تقریباً دوگنی ہو گئی' ڈاسن کا کہنا ہے کہ ان میں ۳۸،۴۳۶ فرانسیسی اور ۴۸،۳۲۱ دیگر اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔ (۳)

مقامی آبادی پر بیرونی دباؤ میں آنے والے سالوں میں مزید اضافہ ہوا اور ۳۱ دسمبر ۱۸۴۶ء تک غیرملکی آبادی کی تعداد ۱۱۰،۸۴۶ ہو چکی تھی جن میں سے ۱۰۷،۶۴۸ یورپی شہروں میں اور ۲۲۳۲ یورپی باشندے الجزائر کے دیہی علاقوں میں آباد ہو چکے تھے۔ صرف ۱۸۴۶ء کے آخری تین ماہ میں ان کی تعداد میں ۳،۸۵۸ کا اضافہ ہوا۔ الجزائر میں موجود جرمنی کے زیادہ تر افراد کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جو ترک سکونت کر کے مستقل طور پر الجزائر میں آباد ہو گئے تھے یہ لوگ فرانس اور اٹلی کے راستے الجزائر پہنچے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پہاڑی علاقوں کا رخ کرتے جہاں کی آب و ہوا جرمنی سے مماثلت رکھتی تھی۔ حکومت فرانس کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۰ء تک الجزائر میں یورپی آبادی میں کمی بیشی کی رفتار یوں رہی:

سال	کل آبادی	اضافہ/کمی	تعداد اضافہ/کمی
۳۱ دسمبر ۱۸۴۶ء	۱۰۹،۴۰۰	---	---
۱۸۴۷ء	۱۰۳،۸۹۳	کمی	۵،۵۰۷
۱۸۴۸ء	۱۱۵،۱۰۱	اضافہ	۱۰،۸۴۴
۱۸۴۹ء	۱۱۲،۶۰۷	کمی	۲،۴۹۴
۱۸۵۰ء	۱۲۵،۹۶۳	اضافہ	۱۳،۳۵۶

ان سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی یہ واضح ہے کہ ہر سال اوسطاً" چار ہزار سے زیادہ یورپی باشندوں نے الجزائر کا رخ کیا جبکہ درست اعداد و شمار کے مطابق یہ اوسط بہت زیادہ رہی۔

(جاری ہے)

(۳) Algeria Dawson Borrer Page 226

فرانس کی حکومت نے ۱۸۴۳ء میں جو اعداد و شمار جاری کئے ان کی مندرجہ ذیل صورت بنتی ہے

۳۱ جنوری	۱۸۴۳ء	۴۷٬۱۵۰
" مارچ	"	۴۷٬۰۳۸
یکم مئی	"	۴۷٬۵۳۴
۳۱ جون	"	۵۵٬۱۳۲
یکم اکتوبر	"	۵۷٬۶۳۲

اسی ذریعے کے مطابق (دیکھیے حوالہ) ان ۵۷٬۶۳۲ غیر ملکی افراد میں مختلف اقوام کے افراد کی تعداد یہ تھی۔ (۴)

فرانسیسی	۲۴٬۲۷۴	ہسپانی	۱۸٬۵۳۸
مالٹا	۶٬۴۰۲	اطالوی	۶٬۳۳۲
جرمن	۲٬۰۸۶		

جون ۱۸۴۲ء کے اختتام پر ۴۰٬۰۰۰ یورپی تھے فوجیوں کی تعداد پہلے ۳۷ ہزار سے ۸۰ ہزار کی گئی اور اسی سال یعنی ۱۸۴۲ء میں یہ تعداد ۹۵ ہزار ہو گئی۔

"زمینوں کی منتقلی کے علاوہ فرانس، کارسیکا، سپین، اٹلی اور مالٹا سے بڑی تعداد میں نو آباد کاروں کو خوش آمدید کہا گیا۔ ۱۸۳۲ء کے آخر میں یورپی باشندوں کی تعداد صرف ۵ ہزار تھی، آنے والے سات سالوں میں اس تعداد میں سات گنا اضافہ ہوا۔ ۱۸۴۷ء تک ان کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی جن میں سے اکثر آباد ہو کر پر سکون زندگی گزارنے لگے تھے ان میں اکثریت کسانوں یا مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تھی۔ نو آباد کاروں نے بڑے بڑے سیکٹر آباد کر لیے تھے۔ ایک کلاس کاروباری افراد پر مشتمل تھی یہ گروہ گرینڈ کولون کہلاتا تھا، ان کے پاس وسیع و عریض اراضی تھی۔ ایک دوسرا طبقہ Petitsblancs کہلاتا تھا، یہ مڈل کلاس سے بہتر حالت میں رہتے تھے اور ان کی معاشی حالت مقامی اور آبائی الجزائریوں) سے بدرجہا بہتر تھی۔

یورپی باشندوں کے یہ دونوں طبقے مسلم دشمنی میں یکجا اور متحد تھے۔ وہ فرانس کے فوجی اقتدار کی بھی مخالفت کرتے تھے کیونکہ ایسی حکومت کی وجہ سے ہی الجزائر میں ان

4 - Tablean Page 88 - 109

کے لیے زمین حاصل کرنے اور اسے زیر استعمال لانے کے مواقع سیاسی طور پر محدود ہو گئے تھے جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔" (۵)

"زمین کے انتقال کے بارے میں پالیسیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ الجزائر کا سارا معاشرہ اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ رشتے ناطے بکھر گئے جائیداد پر حقوق ختم کر دیے گئے۔ جس سے پیداواری عمل بھی شدید متاثر ہوا اور سماجی ڈھانچہ تباہ ہو گیا۔ ایک ہتھکنڈے کے طور پر فرانسیسیوں نے نو آبادیاتی سماجی نظام متعارف کرایا۔ اس نظام کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں اور کاموں کو سرانجام دینے کے طریقے بدل دیے گئے' قدروں کو اپنی شناخت سے محروم کر دیا گیا۔ مقامی آبادی کا مورال ختم کرنے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی جس نے سماجی عمل کو تہہ و بالا کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی غیر متوقع مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا تو کبھی آبادیوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی جاتی۔" (۶)

نو آباد کاروں کے ان اقدامات نے الجزائر کے مسلمانوں کے لیے مسائل کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ حالات کی ناگفتہ بہ کیفیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فرانس' الجزائر میں جس نئے سماج کی تشکیل کا پروگرام چلا رہا تھا وہ نام نہاد نیا سماج' دین و اخلاق سے عاری جان بوجھ کر رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صحت اور غذائیت کے اعتبار سے بھی یہ سماج اپنے ارکان کے لیے وبال جان ثابت ہوا اور صرف بچوں کی شرح اموات اس قدر بڑھ گئیں کہ آبادی کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل تر ہو گیا۔ ۱۸۴۹ء میں ہیضہ کی وباء پھوٹ پڑی جس سے شرح اموات میں زبردست اضافہ ہو گیا اور بے شمار انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس وبا کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف یورپی آبادی میں شرح اموات ۱۰ء۵۹ فیصد تھی حالانکہ اس آبادی کو غذا' صحت' ماحول اور رہائش کی بہترین سہولتیں بھی حاصل تھیں۔

الجزائر کی مقامی آبادی پر دباؤ کا ایک اور ذریعہ یورپی آبادی میں تیز شرح پیدائش تھی مندرجہ ذیل چارٹ سے اس کی تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے۔

صوبے	۱۸۴۷			۱۸۴۸			۱۸۴۹		
	فرانسیسی	دیگر یورپی	کل	فرانسیسی	دیگر یورپی	کل	فرانسیسی	دیگر یورپی	کل
الجزیرہ	۱۳۸۰	۱۱۴۱	۲۵۲۱	۱۳۰۷	۹۷۴	۲۲۸۱	۱۶۰۰	۱۰۸۰	۲۶۸۰

5 - Algeria. The Revolution Institutionalized Page 27

6 - Recognizing Islam : Religion and Society in the Modern Ara by Michael Gilsenan. New York, Pantheon Books, 1982 - Page 145

اوران	۵۳۰	۳۷۸	۲۱۸	۹۵۹	۶۶۰	۱۳۱۹	۷۹۵	۸۴۲	۱۴۳۷
Const.-									
antina	۵۰۰	۳۳۹	۷۴۳	۳۵۵	۲۹۲	۷۳۷	۵۹۵	۳۰۳	۸۹۹
میزان	—	—	۲۲۸۳	—	—	۲۳۳۷	—	—	۵۲۰۹

گویا شرح پیدائش یوں رہی

۱۸۳۷ء میں کل ۳ء۱۲ فیصد
۳ء۵۰ فیصد فرانسیسی آبادی میں
۳ء۷۱ فیصد دیگر یورپی اقوام میں

۱۸۳۸ء میں کل ۳ء۷۷ فیصد اضافہ
۳ء۷۷ فیصد فرانسیسی آبادی میں
۳ء۸۳ فیصد دیگر یورپی اقوام میں

۱۸۳۹ء میں کل ۴ء۶۲ فیصد
۵ء۱۵ فیصد فرانسیسی آبادی میں
۴ء۰۵ فیصد دیگر یورپی اقوام میں

اس طرح ان تین سالوں میں فرانسیسی آبادی میں ۴.۴۷ فیصد اور دیگر یورپی اقوام پر مشتمل آبادی میں ۳.۹۳ فیصد شرح پیدائش رہی (۷)۔

7 - Algeria by J.R Morell, Page - 352

بقیہ : حکمت مودودیؒ

(۷) وان یکون صمتی فکرا — اور یہ کہ میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو۔

(۸) ونطقی ذکرا — اور میری گفتگو ذکرِ الٰہی کی گفتگو ہو۔

(۹) ونظری عبرۃ — اور میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔

ان اوصافِ مطلوبہ کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان امر بالمعروف و انھی عن المنکر یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔ معلوم ہوا کہ نیکی کو پھیلانے اور بدی کو ختم کرنے کے لیے جو امتِ وسط اٹھے اس کے فرد فرد میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔ انہی اوصاف کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ یہ نہ ہوں تو ہم کبھی اپنے منصب کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔

اعتذار

(ہم ذیل میں ترجمان میں شائع شدہ ایک مضمون کے بارے میں جناب خالد فاروق مودودی کا ایک مراسلہ شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ اور مضمون نگار' دونوں موسس رسالہ ترجمان القرآن' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ان تمام اہل خانہ سے معذرت خواہ ہیں جنہیں مضمون زیر تذکرہ کے بعض مندرجات سے تکلیف پہنچی ہے۔ مضمون تحریر کرتے اور شائع کرتے وقت ہمارے سامنے وہ حقائق نہیں تھے جن کی نشان دہی درج ذیل مراسلہ میں کی گئی ہے۔)

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ماہنامہ ترجمان القرآن کے اگست ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں حافظ محمد ادریس صاحب کا تحریر کردہ ایک مضمون ترجمان کے سابق مینجر' مولانا چراغ دین مرحوم کے بارے میں شائع ہوا ہے' جن کا انتقال ۳ جون ۱۹۹۲ء کو ہوا ہے۔ آپ نے یہ مضمون یقیناً اس بنیاد پر شائع کیا ہے کہ مرحوم چراغ دین صاحب' مولانا مودودیؒ کے ابتدائی رفقا اور جماعت اسلامی کے بانی ارکان میں سے تھے' اور وہ دارالاسلام کے قیام کے دوران سے ۱۹۷۸ء تک ترجمان کے مینجر رہے تھے۔ لیکن اس مضمون میں بعض ایسی باتیں اس انداز میں کہی گئی ہیں' جو خلاف واقعہ ہیں اور رسالہ ترجمان القرآن کے موسس' مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اہل خانہ کو تکلیف پہنچانے کا موجب ہوئی ہیں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ترجمان میں ان واقعات کی تصحیح شائع کی جائے۔

مضمون میں کہا گیا ہے کہ گویا مولانا مودودیؒ کے صاحبزادہ' حسین فاروق مودودی صاحب نے مرحوم چراغ دین صاحب کو ترجمان کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کردیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حسین فاروق صاحب نہیں تھے جنہوں نے مرحوم کو ترجمان سے سبک دوش کیا تھا' بلکہ مرحوم چراغ دین صاحب خود اپنی مرضی و ایما سے ترجمان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ان کے از خود ترجمان سے سبک دوش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ایک صاحبزادہ' راولپنڈی میں مولانا مودودیؒ کے داماد' قاضی مسعود احمد صاحب مرحوم (جن کا حال ہی میں ۱۴ جون ۱۹۹۲ء کو انتقال ہوا ہے) کے کاروبار کے انچارج تھے' اور ان سے وہاں بعض مالی بے قاعدگیوں کا ارتکاب ہوا تھا' جن کا اعتراف انہوں نے خود تحریری طور پر کرلیا تھا۔ ان کے صاحبزادہ کی طرف سے مولانا مودودیؒ کے داماد کے کاروبار میں مالی بے قاعدگیوں کے ارتکاب کی وجہ ہی سے مولانا چراغ دین صاحب مرحوم نے از خود ترجمان سے سبک دوشی اختیار کی تھی۔

ادارہ ترجمان القرآن سے علیحدگی کے بعد اگر وہ رنجیدہ دیکھے گئے تو اس کی وجہ یقیناً وہ صورت حال تھی جس نے انہیں اتنے طویل تعلق کو ترک کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

مجھے امید ہے کہ آپ درج بالا تصحیح رسالہ ترجمان کی اولین اشاعت میں ضرور شائع فرما دیں گے۔

خالد فاروق مودودی

رسائل و مسائل

قضا نماز' قربانی کا گوشت' غیر مسلم کا قتل' قربانی کا جانور' کرائے کے مکان پر زکوۃ

سوال:

(۱) صاحبِ ترتیب شخص کی ایک نماز قضا ہو جاتی ہے۔ مثلاً عصر کی نماز قضا ہوئی تھی۔ پھر وہ مغرب کی نماز کے لیے اس وقت مسجد پہنچاجبکہ جماعت بالکل تیار ہے۔ آیا وہ شخص باجماعت نماز چھوڑ کر پہلے قضا ادا کرے یا پہلے مغرب کی نماز پڑھے۔

(۲) قربانی کا گوشت کتنے دن تک رکھ کر کھانا جائز ہے۔ مثلاً ایک شخص نے گائے کی قربانی کی' جس میں سے تقریباً تین من گوشت حاصل ہوا۔ اس شخص نے ایک من گوشت غرباء میں' ایک من عزیز و اقارب میں اور ایک من گوشت فریج میں رکھ کر ایک ماہ تک کھایا۔ کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے۔ (میڈیکل نقطہ نگاہ کے علاوہ)

(۳) کوئی مسلمان ذاتی وجوہ کی بنا پر کسی غیر مسلم کو قتل کر دیتا ہے۔ اس صورت میں کیا اس پر قصاص و دیت کا قانون لاگو ہو گا۔ کیا مقتول کے لواحقین قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ نیز اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق قاتل کی سزا کیا ہو گی۔

(۴) ایک غریب شخص' جس پر قربانی واجب نہیں' قربانی کے لیے جانور خریدتا ہے۔ قربانی سے قبل وہ جانور گم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ شخص بڑی مشکل سے دوسرا جانور خریدتا ہے۔ قربانی سے قبل پہلا جانور بھی مل جاتا ہے۔ کیا وہ شخص ایک جانور کی قربانی دے گا یا دونوں جانوروں کی۔

اسی طرح ایک امیر شخص کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوتا ہے۔ وہ جانور خریدتا ہے۔ گم ہو جاتا ہے پھر اور خریدتا ہے۔ اس وقت پہلا جانور بھی مل جاتا ہے۔ کیا اس امیر شخص پر ایک جانور کی قربانی واجب ہو گی یا دونوں کی۔

(۵) کیا کرائے پر دیے گئے مکانوں پر زکوۃ فرض ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس اپنے استعمال کے علاوہ کچھ مکان ہیں جو کرایہ پر دیے گئے ہیں اور ایک سال سے زائد عرصہ بھی گزر چکا ہے۔ کیا

ان مکانوں پر زکوۃ واجب ہوگی' اگر ہوگی تو کس حساب سے' یعنی کیا صرف حاصل کردہ کرایہ پر' مکان کی کل قیمت پر' مکان کی قیمتِ خرید پر' یا موجودہ قیمت پر۔

جواب :

(۱) صاحبِ ترتیب شخص کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قضا شدہ نماز پڑھے اور اس کے بعد وقتی۔ اگر جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو پھر بھی پہلے قضا نماز ادا کرے اور پھر جماعت کے ساتھ شریک ہوجائے۔ جماعت مل جائے تو فبہا' نہ ملے تو اکیلے پڑھ لے۔

(۲) قربانی کا گوشت پہلے تین دن سے زیادہ ذخیرہ نہیں رکھا جاسکتا تھا' بعد میں اس کی اجازت مل گئی۔ اب جائز ہے کہ جتنے دن ذخیرہ کرسکتا ہو اتنے دن اسے ذخیرہ کرے ۔ ہدایہ میں ہے **"ویطعم الاغنیاء والفقراء ویدخر لقوله علیه السلام کنت نھیتکم عن اکل لحم الاضاحی فکلوا منھا وادخروا"** (کتاب الاضحیہ ج ۴ ص ۴۴۸) "اغنیاء اور فقراء کو کھلائے اور ذخیرہ کرے' جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے کہ میں تمہیں قربانی کا گوشت (تین دن کے بعد) کھانے سے روکتا تھا اب (تین دن کے بعد) کھا سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کرسکتے ہو"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہدایہ میں تصریح ہے کہ کم از کم ایک تہائی حصہ کا صدقہ کردینا مستحب ہے۔ لٰہذا اس قدر تو صدقہ کردے اور ایک تہائی احباب کو کھلانا چاہے تو فبہا ورنہ اس کو بھی خود کھا سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص حد نہیں ہے کہ کتنے دن تک ذخیرہ کرسکتا ہے۔ آج کل اس کے وسائل زیادہ ہوگئے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص گوشت کا کچھ حصہ ایک ماہ تک رکھ سکتا ہو تو اس کی بھی اجازت ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے بخل کا شبہ پیدا ہو اور انسان کی شخصیت پر اس کا اثر پڑتا ہو۔ اعتدال کے ساتھ اور عرف کے دائرہ میں ایسا کیا جائے۔

(۳) مسلمان اگر کسی ایسے کافر کو' جسے اسلامی ریاست کی شہریت حاصل ہو' قتل کردے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ ہدایہ میں ہے " **والمسلم بالذمی**" مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ دار قطنی میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ : **ان النبی صلی الله علیه وسلم قتل مسلما بذمی**۔ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل کیا" (ہدایہ ص ۵۵۹۔ ج ۴ کتاب الجنایات)

(۴) غریب آدمی پر قربانی' جانور خریدنے کے بعد واجب ہو جاتی ہے اور جس جانور کو خریدا گیا تھا اسی کی قربانی لازم ہوتی ہے۔ اگر اس کا جانور گم ہوگیا اور اس نے دوسرا خرید لیا تو دونوں کی قربانی

کرے گا' لیکن صاحبِ نصاب آدمی پر قربانی واجب ہے اور جانور خریدنے سے' خریدے ہوئے جانور کی قربانی اس پر واجب نہیں ہوجاتی' اس لیے اگر وہ جانور گم ہوجاتا ہے تو اس پر قربانی کرنا واجب رہتا ہے' لیکن غریب آدمی کا جانور گم ہو جائے تو اس پر دوسرا جانور خریدنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر امیر آدمی کا جانور واپس مل جائے تو اس پر دونوں کی قربانی واجب نہیں ہوتی۔ غریب نے اپنی مرضی سے اپنے اوپر بوجھ ڈالا ہے نہ کہ شریعت نے۔ اس کو کسی نے نہیں کہا کہ جانور خریدے اور خریدا ہوا جانور اگر گم ہوگیا تھا تو اسے کسی نے نہیں کہا کہ اب وہ دوسرا جانور خریدے۔ اس کے برعکس امیر پر تو شرع نے ایک قربانی واجب کی ہے۔ اگر اس نے دس جانور خریدے اور وہ گم ہوگئے تو پھر بھی اس پر جانور خرید کر قربانی کرنا واجب ہوگا' بشرطیکہ وہ پھر بھی صاحبِ نصاب ہو۔

(۵) کرایہ پر دیے گئے مکانات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ ان کی آمدنی کو جمع شدہ رقم کے ساتھ ملا کر سال کے آخر میں ساری رقم کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ بشرطیکہ اس کے پاس پس انداز کی ہوئی رقم ہو اور کرایہ کی آمدنی کے ساتھ مل کر مقدارِ نصاب کو پہنچ جاتی ہو۔ مثلاً ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپے کی رقم ہے۔ کرایہ کی آمدنی ماہ بماہ اسے ہوتی ہو اور اس میں سے کچھ یا ساری اس کے پاس ہزار روپے کے ساتھ جمع ہوتی رہے۔ دورانِ سال کبھی ڈیڑھ ہزار' کبھی دو ہزار' کبھی سات سو ہو جاتی ہو لیکن رقم کا کچھ حصہ بہرحال موجود رہتا ہو اور سال کے بعد تین ہزار ہو جائے اور ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت بھی تین ہزار ہوتی ہو تو اس پر تین ہزار کی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

مطبوعات

تائیدِ جبرئیل : حافظ لدھیانوی۔ پتہ : بیت الادب ۶ ر ۳۴ راجہ روڈ، گلستاں کالونی، فیصل آباد۔ صفحات ۱۶۰، قیمت ۷۰ روپے۔

سچا نعت نگار وہ ہے جس کے رگ و پے میں حبِّ رسولؐ رچ بس جاتی ہے اور پھر نعتیں اس کے دل و دماغ سے گل و ریحاں کی طرح اگنے لگتی ہیں، پھول آتے ہیں اور ان کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ حافظ صاحب نے خدا کے فضل و کرم سے یہ مقام پالیا ہے۔ اب غالباً ان کا حال یہ ہوگا کہ کسی نہ کسی نعت کا کوئی مصرع یا مطلع یا سلسلہ، قافیہ و ردیف یا مقطع یا کوئی مضمونِ نو ان کی تخلیقی فضاؤں میں ہر وقت جھلکتا رہتا ہوگا۔

قادر الکلامی کے ساتھ "مضامین نوبہ نو کے انبار" لگانے کا یہ سلسلہ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے دسویں مجموعۂ نعت تک آ پہنچا ہے۔ آج کل بچوں کی طرح کتابوں، رسالوں کے نام رکھنا بڑا مشکل ہوگیا ہے، خصوصاً نعتیہ مجموعوں کے معاملے میں۔ کیونکہ پچھلے دس بارہ سال سے اس تیزی سے درجنوں نعت نگاروں کے مجموعے نوبہ نو ناموں کے ساتھ آئے ہیں کہ نئے نام کے لیے راستہ نہیں ملتا ہے۔ مگر حافظ صاحب کے ذہن کو خوب سوجھی کہ نعت نگاری (حقیقی اور مخلصانہ) ہوتی ہی تائیدِ جبرئیل سے ہے، پس انہوں نے تازہ مجموعے کا نام ہی "تائید جبرئیل" رکھ دیا ہے۔ یہ نام بہت پچ گیا ہے۔

حافظ صاحب کے فنی کارناموں پر تو کچھ کہنا اس لیے ضروری نہیں رہا کہ اب وہ پاکستان کے اوّل درجے کے چار چھ نعت نگاروں کی صف میں ہیں۔ تنقید، تحسین اور تنقیص سے بے نیاز! حمد باری تعالیٰ اور دعا کو چھوڑ کر تقریباً ۹۰ نعتیں ہیں۔ ہر نعت میں شانِ نبوت کا ایک جلوہ اور ہر شعر میں اس جلوے کی منعکس کرنیں، آدمی انتخاب کیا کرے۔ یونہی دو تین شعر بغیر انتخاب کے لکھتا ہوں :

معراج ہو عطا مجھے حسنِ خیال کی
سارے جہاں سے رنگ جدا نعت کا رہے
(دعا)

جیتے جی اس پہ گزرتی ہے قیامت کیا کیا
جب کوئی شخص مدینے سے جدا ہوتا ہے
(ص ۳۲)

تڑپ دل کی، خلشِ جاں، نمی آنکھوں کی لایا ہوں
عطا کی ہیں مجھے محبوبِ داور نے یہ سوغاتیں
(ص ۵۳)

وہ جس کی ایک کرن ظلمتوں کو چیر گئی
سمٹ کے آگیا وہ آفتاب آنکھوں میں
(ص ۹۹)

مدح کے رخ بدلتے رہتے ہیں
تازہ مضموں نکلتے رہتے ہیں
(ص ۱۵۳)

(ن - ص)

مخفی ہاتھ: محمد اکرم رانجھا' ایڈووکیٹ۔ ناشر: ادارۂ علم و ادب پاکستان۔ باہتمام اسلامی اکادمی' منصورہ' لاہور۔ صفحات ۱۱۲' قیمت ۳۰ روپے۔

دوآبہ چج کا ایک گبھرو کسی واردات کی وجہ سے فوج داری قانون کے تحت عمر قید کی سزا کے شکنجے میں آگیا۔ آج وہی نوجوان اپنے دفتر میں بیٹھا ایم اے' ایل ایل بی کی ڈگریوں کے ساتھ بے گناہوں کو معاشرے کے دجل و فریب اور قانون کے خونیں شکنجے سے بچانے کے لیے اعلیٰ عدالتوں میں وکالت کر رہا ہے۔ نام ہے محمد اکرم رانجھا!

اس نے جہلم اور چناب کے دریاؤں کے درمیان اپنے زادِ بوم میں جہاں رانجھا اور گوندل دو قبیلے تقریباً ایک ہزار دیہات پر قابض تھے' آنکھیں کھولیں' اکڑتی تنتی جوانیاں دیکھیں' سالم بکرا کھا جانے والے اور ۲ سیر دودھ پی جانے اور ۵ سیر گھی نوش کرکے چناب کو تیر کر ادھر سے اُدھر

پار کرنے والے گبھروؤں کو دیکھا' جہاں گھوڑیاں تھیں' جہاں معصوم الھڑ جوانیاں تھیں' جہاں نعمتوں کی فراوانی کی سرزمین سے جھگڑے' فساد اور جرائم اگتے تھے' وہاں کے زندہ واقعات کو حسنِ فطرت کے پس منظر کے ساتھ خوبصورت ادبی کہانیوں کی شکل میں پیش کیا۔ خاص بات یہ کہ ظاہر کرداروں کے ساتھ ساتھ اسے ایک غیر مرئی ہاتھ (امرِ ربی) ایسا کام کرتا دکھائی دیتا کہ بعض بڑی غرور و ظلم کی قوتیں کسی ظلم کی پاداش میں پستی میں گر کر ختم ہو جاتیں اور کبھی نہایت ادنیٰ سطح سے اپنے حسن و کردار کے بل پر کوئی فرد یا خاندان بلندی پر پہنچ جاتا۔ یعنی یہ سب کچھ اندھا اتفاق نہیں' بلکہ کسی شعوری طاقت کا منصوبہ کام کر رہا ہے۔

محمد اکرم رانجھا نے اپنی کہانیوں کے پیکر خیالوں سے نہیں گھڑے بلکہ واقعاتی دنیا اور گرد و پیش کے ماحول سے ایسا مواد ہمارے سامنے رکھا ہے کہ جو ادبیت کے کسی معیار کے لحاظ سے کم تر نہیں ہے۔ پھانسی پانے والے مجرم' عمر بھر کے قیدی' برادریوں کی روایات' سیاسی شخصیتوں سے جیل میں ملاقاتیں' جیل کے حالات' یہ سارے عناصر کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں اور سلطان باہوؒ کی رباعیاں اور ان کے ساتھ ماہیے' جوانیوں کے باہمی مخفی رابطہ ہائے نگاہ و خیال' ان کی جدائیاں اور ان کے درد و کرب کو پڑھ کر میرے لیے سونا مشکل ہو گیا اور دیر تک شعر پڑھتا رہا۔

واقعاتی افسانے یوں تو ایک ایک کردار کے متعلق بڑے مؤثر ہیں۔ مگر "جبری لام بندی" کا تذکرہ بہت ہی ولولہ انگیز ہے۔ نہایت درجہ قوت و حسن والے آزاد منش نوجوانوں کو انگریزوں نے جبری لام بندی کے تحت فوج میں بھرتی کرنے کا آرڈر کیا اور اپنے تمام محکموں کے افسروں کو ان ایجنٹوں کی مدد میں لگا دیا' جو چھ چھ روپے ماہانہ پر نوجوانوں کو پکڑ لے جاتے تھے۔ آخر نوجوانوں نے بھاگنا شروع کیا اور مرد بھی جنگل میں چھپ جاتے۔ لیکن ظالموں نے ہر گاؤں کی عورتوں کو باہر لا کر کپڑے اتروا کر پوہلی کے کانٹے پولیس کے ذریعے ان کی رانوں میں گھسائے۔ کچھ دن کے اس ظلم پر کہرام مچ گیا اور گوندل اور گرانہ برادریاں شعلہ بار ہو گئیں۔ پھر ایک دن تحصیل دار کی سرکردگی میں جفا گرانِ سرکار کا قافلہ آ پہنچا اور تحصیل دار کے لیے پیلو کے درخت کے نیچے کرسی بچھائی گئی۔ بے شمار گبھروؤں اور ان کی منگیتروں کی آہ و زاریاں رہیں الگ' پانچ باریش بزرگ پیش ہوئے اور عرض کی کہ وہ ان نوجوانوں پر رحم کرے اور بھرتی پر مجبور نہ کرے۔ تحصیل دار بپھر گیا' تب ایک بزرگ رانجھے کی آنکھوں میں خون اتر آیا' وہ زخمی شیر کی طرح دھاڑا اور کہا:

تحصیل دار! اَج انج نئیں ہونا' اَج اَنج ہونا اے۔

پھر لاٹھیاں چلیں اور کرسی بھی ٹوٹ گئی اور تحصیل دار کی کھوپڑی میں سے بھی بھیجا بہہ نکلا۔

بدقسمتی سے ہماری محل سرائے ادب پر بڑا سخت پہرا ہے اور کسی کو جب تک اندر کے خداوندوں سے ادبیت کا لائسنس نہ مل جائے' وہ کتنی بھی کہانیاں اور اشعار لکھتا پھرے' اسے پہرے دار اندر نہ جانے دیں گے۔

تو ایک ہے محل سرا کے اندر کا ادب' اور دوسرا ہے محل سرا کے باہر کا ادب۔

محمد اکرم رانجھا باہر کے ادب کا قلم بردار اور علم بردار ہے۔ جو ایسی کہانیاں پیش کرتا ہے جو معاشرے کے اندر سے اگتی ہیں اور خیالی کہانیوں سے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہیں۔

(ن - ص)

وطن کا قرض: مرتبین: قیصر قمری' نثار احمد زبیری اور نور العین نوید (مرحوم)' ناشر: ادارہ ادبیات کراچی۔ صفحات ۳۲۰۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

یہ ایک خاص اصول و مقصد کے تحت مرتب شدہ افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کے افسانوں میں سے یہ ایک انتخاب ہے۔ اس کام کا آغاز اوپر دیے ہوئے تین ناموں سے متعلق ہے۔ نور العین نوید جو اس سارے نظامِ کار کی روح و رواں تھے اور سعودی عرب میں انجینیری کا ایک دور گزار کر وطن واپس آئے تھے' ان کا جذبہ یہ تھا کہ ادب کی جو چنگاری ہمیشہ سے ان کے قلب میں دبی رہی ہے' اس سے کام لے کر وہ ماحول کو گرمائیں۔ دو ہم نظر ساتھی ان کو ملے۔ کام کی ابتدا ہو گئی۔ ادارہ ادبیاتِ پاکستان کا مقصود یہ قرار پایا کہ نگارشات میں مثبت اور تعمیری رنگ ہونا چاہیے' نہ یہ کہ مایوسی اور خواہش پرستی اور تقلید کا انداز۔

اس ادارے نے پہلا کام یہ شروع کیا کہ منتخب افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کرنے کے منصوبے کو سامنے رکھا جو تشکیلِ پاکستان کے وقت' یا ستمبر ۶۵ء کے موقع پر' یا ۱۹۷۱ء میں علیحدگی' بنگلہ دیش کی دھواں دھاری میں پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والے لاکھوں افراد کی خدمات کو نمایاں کرے' تاکہ نئی نسل یہ جان سکے کہ نہ پاکستان کوئی کھیل ہے' اور نہ اسلام کوئی تماشا۔ بلکہ ہمارے اسلاف نے نصف صدی میں جو قربانیاں اسے قائم کرنے اور اس کو تحفظ دینے کے لیے دی ہیں وہ پچھلی نسل کی طرف سے نئی نسل کے نام وطن کا قرض ہیں اور اب اس قرض کو چکانا ان کی ذمہ داری ہے۔ یعنی دولت پرستی' لوٹ مار' خونریزی اور صوبائیت و لسانیت کے جنون کے

دور میں ادارہ ادبیات نے یکایک قرضے کا ایک ادبی تمسک ان کے سامنے رکھ دیا کہ لوگو! ہوش کرو' تمہارے سر تو بڑے واجبات ہیں۔

اس منصوبے کے تحت ان تین مجاہدینِ ادب نے کونے کونے میں مطلوبہ افسانوں کی تلاش شروع کی تو یہ کام ایسا تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئیاں تلاش کی جا رہی ہوں۔ ۲ سال میں ۶۲ افسانے ابتدائی طور پر جمع کیے گئے۔ پھر انتخاب کیا تو ۲۱ افسانے رہ گئے۔ ان کی نقول جناب فرمان فتح پوری' جناب ابوالخیر کشفی' جناب شمیم احمد' جناب سحر انصاری' جناب معین الدین عقیل اور جناب طاہر مسعود جیسے ناقدین اور ممتاز قارئین کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ آخر کچھ اضافوں کے بعد ۳۴ افسانوں کا مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔

ہم نے سارے افسانوں کا مطالعہ کیا' اور ان میں سے ہر ایک کی روح اور ساخت و بافت کو سمجھا۔ اب ہم مختصراً یہی عرض کریں گے کہ اس مجموعے کی کہانیوں کو' جو کتنی ہی نگاہوں کی کسوٹیوں سے گزر کر آپ تک پہنچی ہیں' اگر بہترین افسانے نہ بھی قرار دیں تو یہ بہت اچھے افسانے ضرور ہیں۔ خصوصاً "لچک" "یزید" "آپا" "ایک پیاز دو روٹیاں" "اصحابِ تحیّر" "چند یادیں" "ایک بن لکھی رزمیہ" "دراڑوں میں سانپ" "باپ بیٹے" "سمجھوتہ ایکسپریس" "خوشبو" ذہن پر ایک اثر چھوڑ گئی ہیں۔ مگر بقیہ کہانیاں بھی معمولی نہیں' شاید بیان شدہ ناموں سے بعض اونچی ہوں۔ "ایک پیاز دو روٹیاں" کو بالعموم پسند کیا گیا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ایک ایک کہانی پر دو دو جملے لکھنے کے لیے بھی وقت چاہیے اور رسالے کے صفحات چاہئیں' جبکہ ہمیشہ سے بڑھ کر منتظر کتابوں کا لمبا "کیو" لگا ہوا ہے۔

ادارہ ادبیات پاکستان نے نصف صدی کا ایسا ادب نئی نسل کے سامنے آئینہ بنا کر رکھ دیا ہے کہ وہ اس میں ماضی سے لے کر حال تک کی اپنی تصویریں دیکھ سکتی ہے۔ جن کو دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ ان پر وطن کا قرض کیا اور کتنا ہے؟

کاش کہ برادرم نورالعین نوید کو کچھ اور زندگی ملتی تو وہ ادب کی مزید اعلیٰ خدمات انجام دے سکتے۔

(ن۔ ص)

ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور-۵۴۵۷۰ پاکستان

(1)

حوالہ نمبر ____________

تاریخ ____________

ترجمان القرآن اگست ۱۹۹۲ سے

✓ صفحہ ۳ تا ۱۰ صفحہ ۴۹ تا ۵۶ (کمی بیشی ہو سکتی ہے)

8 — 8

جولائی - اگست
شمارہ ۷-۸ جلد ۲

ستمبر - اکتوبر
شمارہ ۹-۱۰ جلد ۲

ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۹۲ کے شمارہ سے (3)

✓ صفحہ نمبر ۲۸ تا ۴۲ مع بقیہ

۱۵ صفحات

ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۹۲ شمارہ سے

نومبر - دسمبر
شمارہ ۱۱-۱۲ جلد نمبر ۲

(2) ✓ صفحہ ۳۳ تا ۳۹ صفحہ ۴۹ تا ۵۶

۷ — ۸

(15)

[illegible]

27|+۱۹۲

فون ۳۳-۰۴۲ [illegible] ٹیلیکس ۴۴۵۲۵ اسلام-پی-کے ۰ فیکس ۴۴۷۹۰۲

REGD. NO. L 5340 PHONE: 234014 236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE